داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے
"نگار" آٹھ روپیہ سات آنے میں وی پی ہوگا

نگار

اس امر کی کہ آپ کا چندہ اکتوبر میں ختم ہوگیا اور نومبر کا جس میں سالنامہ ۵۴ء کی قیمت بھی شامل ہے

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۴ | فہرست مضامین اکتوبر ۵۳ء | شمار ۴

ملاحظات ---------- ۴
مومن کا تغزل ----- نظیر صدیقی ------ ۶
دُنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے ---------- ۱۳
فنِ تحریر کی تاریخ ---- محمد اسحاق صدیقی --- ۱۷
اقبال سہیل ------- رشید احمد صدیقی --- ۲۹
جنگ کی ہولناک تاریخ ---------- ۳۷
گاہے گاہے باز خواں ---------- ۴۱
باب الاستفسار ---------- ۴۸
دعوتِ نقد و نظر ---------- ۵۲
منظومات ... شور - اکرم - مختار علی - نفس - ندیم -- ۵۴

ملاحظات

ہمارا نصابِ تعلیم

تقسیم ہند سے قبل ہندوستان کا نصاب تعلیم جن اصول پر مقرر کیا گیا تھا وہ یکسر غیر ملکی تھا، اور ملک و قوم کا کوئی مستقبل واضعینِ نصاب کے سامنے موجود نہ تھا

انگریزوں کے سامنے صرف دو مقصد تھے، ایک یہ کہ انگریزی میں کام کرنے والے کلرک و عمال ان کو میسر آجائیں اور دوسرے یہ کہ ہندو مسلمان دونوں جماعتوں کے درمیان اتفاق و اتحاد نہ ہوسکے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے دونوں مقصد میں کامیاب ہوگئے - لیکن اب کہ ملک آزاد ہوچکا ہے اور حکومت خود اپنی ہے، تعلیم کے مسئلہ کو بالکل مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھنا چاہئے، کیونکہ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے تمام اقتصادی مسایل اسی سے تعلق رکھتے ہیں

یہ مسئلہ اپنی جگہ بالکل طے شدہ ہے کہ ملک کے کسی فرد کو جاہل نہ رہنا چاہئے، لیکن یہ کوشش کہ ملک کا ہر ہر بچہ آیندہ چل کر حکیم و فیلسوف، یا ادیب و پروفیسر بنے بالکل بے معنی سی بات ہے جبکہ علمی قابلیت یا واقفیت عامہ کے لحاظ سے اسوقت کا گریجویٹ، انگریزی زمانہ کے گریجویٹ کے مقابلہ میں بھی طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتا ہے، چہ جائیکہ اس سے یہ توقع رکھنا کہ آیندہ چل کر وہ کوئی بڑی اہم ہستی بن سکے گا

نصابِ تعلیم کا یہ انحطاط تقسیم ہند سے پہلے ہی شروع ہوگیا تھا، لیکن اب وہ اپنے انتہائی نقطہ پر پہونچ گیا ہے، کیونکہ ہماری حکومت ہر چیز کو قدامت پسندانہ نگاہ سے دیکھتی ہے اور حال و مستقبل کی گتھیوں کو ماضی کی روایات سے سلجھانا چاہتی ہے

سب سے پہلے جو چیز اس سلسلہ میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ مسئلۂ زبان ہے لیکن اس باب میں ہماری حکومت بڑی غیر دانشمندانہ عجلت سے کام لے رہی ہے اور ہندی کو ذریعہ تعلیم قرار دیکر وہ ملک کو بڑا نقصان پہونچا رہی ہے - کیونکہ ہندی ابھی ۵۰ سال تک اس قابل نہیں ہوسکتی کہ وہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش آسکے اور جب وہ اس منزل تک پہونچے گی تو دوسری زبانیں

آیندہ اشاعت سے ایک نہایت دلچسپ سلسلۂ مضامین "ڈاکٹر مصدق کے عروج و زوال کی کہانی کے عنوان سے شائع ہوگا جو "ایرانی سیاسیات" کے ایک ماہر مستشرق طہران نے خود حالات کا مطالعہ کرکے سپرد قلم کیا ہے۔

بہت آگے بڑھ چکی ہوں گی اور اس طرح ہندی ہمیشہ ۵۰ سال پیچھے رہے گی

اصل مقصد ملک کی ذہنی ترقی ہے اور اس کے لئے کوئی ایسی قید لگانا جو حصول مدعا کے منافی ہو حد درجہ حماقت ہے۔ ضرورت تھی کہ انگریزی کو بدستور ذریعہ تعلیم برقرار رکھا جاتا اور ہندی و سنسکرت کو بتدریج ترقی دیجاتی یہاں تک کہ ان میں ذخیرہ علوم و فنون فراہم ہو جاتا اور عوام ان سے بخوبی آشنا ہو جاتے

خیر، یہ تو زبان کا مسئلہ تھا، لیکن اب نصاب کو دیکھئے تو وہ اور زیادہ ناکارہ نظر آتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ تعلیم کا مقصد کیا ہے اور لوگ اپنے بچوں کو کالج و یونیورسٹی میں کیوں بھیجتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ پڑھ لکھ کر اپنی روزی کمانے کے قابل ہو سکیں اور یہ مقصد قطعاً موجودہ تعلیم سے پورا نہیں ہوتا

یقیناً نہ حکومت تمام فارغ التحصیل طلبہ کو نوکریاں دے سکتی ہے اور نہ صنعتی اداروں میں ان کی کھپت ہو سکتی ہے کیونکہ وہ اس قابل ہی نہیں کہ وہاں کچھ کام کر سکیں، اس لئے ظاہر ہے کہ اس طرح ہر سال بیکار پڑھے لکھوں میں لاکھوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے جو بڑے خطرہ کی چیز ہے

ملک میں تعلیمی مسئلہ پر غور کرنے کے لئے کمیٹیاں مقرر ہوتی ہیں، ماہرین فن کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں، اصلاحات کی طویل فہرستیں مرتب کی جاتی ہیں، لیکن یہ سب کام اسی دائرہ کے اندر رہ کر ہوتا ہے جو پہلے بن چکا ہے، اس سے باہر قدم نکال کر غور نہیں کیا جاتا۔ وہ امتحانات کے طریقوں میں ردوبدل کی سفارش کرتے ہیں، بعض امتحانات کو حذف کر دینے کی رائے دیتے ہیں لیکن اس پر کوئی غور نہیں کرتا کہ جو طلبہ یونیورسٹیوں سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں وہ کس مرض کی دوا ہیں

ہندوستان بہت بڑا ملک ہے اور دنیا کی کوئی چیز معدنی و غیر معدنی ایسی نہیں جو یہاں موجود نہ ہو، لیکن نہ اس سے پورا فایدہ اٹھایا جاتا ہے اور نہ ملک کے فرزندوں کو اس سے فایدہ اٹھانے کا اہل بنایا جاتا ہے، یہاں تک کہ بیکاری اور اقتصادی بے چینی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور حکومت و عوام کے تعلقات ناخوشگوار ہوتے جاتے ہیں

اس وقت ترقی کا ذریعہ دنیا میں صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ملک کو یکسر صنعتی بنا دیا جائے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ ملک کے فرزندوں میں اسکول و کالج ہی کے زمانہ سے میکانکی و صنعتی ذہنیت پیدا نہ کریں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ امریکہ، روس، چین و جاپان، ہر جگہ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے اب ادیب و شاعر، فلسفی و پروفیسر کی جگہ صرف انجینیر پیدا کئے جاتے ہیں اور وہاں کے طلبہ کو صرف ان فنون کی تعلیم دیجاتی ہے جو ابتدا ہی سے ان میں خود اعتمادی پیدا کر دیتی ہے پھر کس قدر عجیب بات ہے کہ ہم اپنے ملک کو صنعتی ملک تو بنانا چاہتے ہیں لیکن نصاب تعلیم یکسر غیر صنعتی رکھتے ہیں

کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بعض طلبہ میڈیکل لاین میں چلے جاتے ہیں اور بعض انجینیری میں، لیکن اول تو وہ مشکل سے امتحان مقابلہ میں کامیاب ہوتے ہیں اور جو موجود بھی ہیں ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر پرائمری درجوں سے ٹکنکل تعلیم کا انتظام کیا جائے اور بچوں کے رجحانات معلوم کر کے انھیں کے مطابق ہائی اسکول اور کالج میں ان کو اپنے ذوق کی تکمیل کا موقع دیا جائے تو وہ آگے چل کر خود اپنے لئے بھی مفید ہو سکتے ہیں اور ملک کے لئے بھی — دوسرے ملکوں میں چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتیں اس قدر ترقی کر گئی ہیں کہ گھر کا کوئی فرد بیکار نہیں رہتا اور ہر شخص کچھ نہ کچھ کما لیتا ہے، لیکن اس میں کامیابی اسی وقت ہو سکتی ہے جب ابتدائی تعلیم اسی نہج سے شروع ہو۔ یقیناً ملک کا ہر فرد ماہر انجینیر نہیں بن سکتا، لیکن ہمارے دنیاوی و معاشی نظام میں جن افراد کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب انجینیر ہی نہیں ہوتے بلکہ کاریگر ہوتے ہیں اور یہی ہم کو پیدا کرنا ہیں۔

بہرحال ہم سمجھتے ہیں کہ تعلیم کا مسئلہ اسوقت کا اہم ترین مسئلہ ہے اور اگر موجودہ نصاب تعلیم کو بدل کر اسے ملک و قوم کے لئے مفید نہ بنایا گیا تو تعلیمی اداروں کا کام صرف انارکسٹ پیدا کرنا رہ جائے گا۔

مومنؔ کا تغزل

(بہ سلسلۂ ماسبق)

مومن کی غزلیہ شاعری کے بنیادی اور اہم پہلوؤں پر دوسرے ارباب قلم کے جن خیالات سے مجھے اختلاف رہا ہے وہ معرضِ بحث میں آچکے۔ لیکن یہاں تک جو کچھ لکھا گیا اس سے میرا مقصود نہ تو مومن کے نقادوں کی تنقیص ہے اور نہ خود مومن کی تحقیر۔ ممکن ہے کہ دوسروں کے خیالات کی تردید میں، میں نے جو کچھ کہا ہے وہ بھی غلطیوں سے خالی نہ ہو۔ اس مقالہ میں، میں نے کئی جگہ مومن کی شاعری کے ناقص پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے لیکن اس سے میرا مقصد مومن کی تضحیک و تحقیر ہرگز نہیں، میں مومن کے تغزل کا قایل ہوں۔ اس مقالہ میں جابجا ان کے تغزل کے محاسن کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اب آپ ان کی غزلیہ شاعری کے اس حصے کو ملاحظہ فرمائیں جس کا حُسن اور لطف میرے نزدیک کسی دور میں ختم ہونے کا نہیں کیونکہ اس کی بنیاد خلوص پر ہے اور بقول شخصے اس میں "سچی سچی باتیں ہیں پوری پوری حالت ہے"

مومن کا یہ شعر کس نے نہ سُنا ہوگا ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن کے پرستار پروفیسر ضیا نے اپنے مضامین میں جہاں جہاں اس شعر کا حوالہ دیا ہے وہاں اس کے متعلق غالب کا یہ جملہ بھی لکھا ہے :- "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دیدیتا" اس میں شک نہیں کہ یہ شعر مومن کے بہترین اشعار میں سے ہے۔ لیکن اسی زمین میں مومن کے اور بھی جواہر ریزے ہیں جن کی طرف عموماً توجہ نہیں کی جاتی ؎

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا
آہ طول امل ہے روز افزوں — گرچہ اک مدعا نہیں ہوتا
دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو — دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

مومن کی شاعری میں ناصح اور رقیب کا عمل دخل بہت زیادہ ہے۔ یوں بھی اُردو شاعری میں ناصح اور رقیب کا ذکر اتنی کثرت سے کیا گیا ہے کہ ان دونوں کا نام لیتے وقت ذہن میں صرف ایک روایت کا خیال آتا ہے اور بس۔ اور اس میں شک نہیں کہ ہماری شاعری میں ناصح اور رقیب سے متعلق جو مضامین باندھے گئے ہیں وہ زیادہ تر رسمی اور روایتی ہیں۔ بایں ہمہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک عاشق کی راہ میں ناصح اور رقیب بھی آتے ہیں لہٰذا اگر کسی کی عشقیہ شاعری میں ان دونوں سے متعلق اچھے اشعار ملیں تو اُن کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں ناصح سے متعلق مومن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

کہنا پڑا مجھے پئے الزام پند گو — وہ ماجرا جو لائق شرح و بیاں نہیں

اے ناصحو آ ہی گیا وہ فتنۂ ایام لو — ہم کو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام لو
چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی — ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے
ہوش گئے یاں دل سے پہلے ہووے سمجھ تو سمجھیں بات — یہ تو سمجھئے حضرت ناصح آپ کسے سمجھاتے ہیں،
تو نہ جانے عشق بازی اور ہم نادان ہوں — بے سمجھ کہتا ہے ناصح تو نے کیا سمجھا ہمیں
کیا کروں کیونکر رکوں ناصح رکا جاتا ہو دل — پیش کیا چلتی ہے اُس سے جس پر آجاتا ہو دل
اس وسعت کلام سے جی تنگ آگیا — ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا گیا
ناصح یہ گلہ کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا — تو کب مری سنتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

عام طور پر ناصح سے متعلق اشعار اپنے اندر مزاح کی چاشنی لئے ہوتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض تفننِ طبع کے طور پر کہے گئے ہیں لیکن مومن کے مندرجۂ بالا اشعار کا انداز ان سے قطعی مختلف ہے۔ ان سے یہ بات واضح طور پر مترشح ہے کہ یہ اشعار ان جذبات و تاثرات کی ترجمانی کے لئے کہے گئے ہیں جو عشق و محبت سے باز آنے کی نصیحتیں سُن کر ایک عاشق کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان اشعار میں ناصح کی تضحیک کہیں نہیں کی گئی البتہ اس کو محبت آشنا دل کی مجبوریاں سمجھانے کی کوشش ضرور کی گئی ہے اور وہ بھی ایسے پیرائے میں کہ ان اشعار کو پڑھتے وقت عاشق کی دل سوزیوں میں شریک ہونے کے باوجود ناصح سے نفرت نہیں پیدا ہوتی البتہ اُس پر رحم ضرور آتا ہے۔

رقیب سے متعلق بھی مومن کے دو تین شعر سن لیجئے:۔

جان نہ کھا وصل عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں — جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے
یاس دیکھو کہ غیر سے کہہ دی — بات اپنی امیدواری کی

جن لوگوں نے اُردو شاعری کے دواوین کا مطالعہ کیا ہے وہ ان دواوین کے صفحات پر ایسے عاشقوں سے دوچار ہوئے ہوں گے جو محبوب کے جور و ستم نازہ غرور، بے التفاتی و بے وفائی، کم نگاہی و کج ادائی، ان تمام چیزوں کو شربت کی طرح پی جاتے ہیں۔ اور ان کے خلاف لب کشائی کو شانِ عاشقی کے منافی گردانتے ہیں، حالانکہ ایک گوشت پوست کے بنے ہوئے عاشق کے لئے تسلیم و رضا کا مجسمہ بن جانا ممکن نہیں۔ چنانچہ محبت میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب کہ عاشق اپنی تمام چاہت اور محبت کے باوجود محبوب سے روٹھ جاتا ہے، اس سے رشتۂ محبت منقطع کر لینے پر آمادہ ہوجاتا ہے، اُس کو سخت سُست باتیں کہہ دیتا ہے۔ اُس کو منانے کی بجائے خود منائے جانے کا آرزومند ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس قسم کے جذبات ہنگامی ہوتے ہیں۔ رنجش اور خفگی کے عالم میں عاشق جن باتوں کا ارادہ کرلیتا ہے انکو عمل میں لانے پر قادر نہیں ہوتا اور کچھ ہی دیر میں اپنے دل کے ہاتھوں اس شعر کا مصداق بن جاتا ہے:۔

پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں، — پھر وہی زندگی ہماری ہے

چونکہ مومن کا عشق بھی ایک گوشت پوست کے انسان کا عشق ہے لہذا وہ بھی اپنے عشق کے باوجود محبوب کے سامنے ہمیشہ سر تسلیم خم کئے نظر نہیں آتے۔ بلکہ خاموش شکایت سے لیکر برملا طعن و طنز تک تمام مرحلوں سے گزرتے دکھائی دیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم — بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کچھ سن کے جو میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو — سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
بے وفا کہنے کی شکایت ہے — تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا

جن سے منظور وفا ہے، ہو جفا بھی ان پر
مجھ سے کچھ کام نہیں ہے تو ستاتے کیوں ہو

تڑپنے لوٹنے رونے کا باعث تجھ پہ بھی کھلتا
ترے دل کو بھی میری سی اگر لے بے وفا لگتی

عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو
کہ شبِ غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے،

بخت بد نے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں
تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

آپ کی کون سی بڑھی عزت
میں اگر بزم میں ذلیل ہوا

جب دل میں جذبات کا طوفان برپا ہوتا ہے تو انسان اظہار تمنا اور عرض مدعا سے قاصر رہتا ہے اور اگر کچھ کہنے کی کوشش کرتا بھی ہے تو الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ بلکہ وفور جذبات کے باعث لبوں سے الفاظ نکلنے کے بجائے آنکھوں سے صرف آنسو نکلتے ہیں۔ مومن نے اِس کیفیت کی کتنی عمدہ تصویر کھینچی ہے:-

نالہ ہی نکلے ہے گو ہم مدعا کہنے کو ہیں
لب نہیں کہنے میں اب کیا جانے کیا کہنے کو ہیں

مومن نے اس زمین میں اور بھی کئی عمدہ شعر کہے ہیں ؎

دوست کرتے ہیں ملامت غیر کرتے ہیں گلہ
کیا قیامت ہے مجھی کو سب بُرا کہنے کو ہیں

ترجمان التماس شوق ہے تغیرِ رنگ
جوں زبانِ شمع عاشق بے صدا کہنے کو ہیں

شکوہ حرف تلخ کا یا شور بختی کا گلہ
ہم جو کچھ کہنے کو ہیں سو بے مزا کہنے کو ہیں

غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے پھر ہم بھی کچھ
آرزوہائے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہیں

محبوب نے عاشق کی چشم شوق پر افشائے محبت کا الزام عاید کیا۔ عاشق الزام کی تردید میں کہتا ہے کہ خود تمھاری مجوب نگاہی نے راز محبت کو فاش کرنے میں کون سا دقیقہ اٹھا رکھا تھا جو چشم شوق کو ملزم ٹھہراؤں ؎

میں اپنی چشم شوق کو الزام خاک دوں
تیری نگاہ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

دیوان مومن میں کئی مسلسل غزلیں ملتی ہیں۔ ایک غزل میں اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ اگر ہم دام محبت میں گرفتار نہ ہوتے تو روح و قلب کی کن اذیتوں سے محفوظ رہتے۔ دو چار شعر سے قطع نظر پوری غزل مرصع ہے اور ہر شعر درد و حسرت کا مرقع۔ ملاحظہ ہو ؎

جو پہلے دن ہی سے دل کا کہا نہ کرتے ہم
تو اب یہ لوگوں کی باتیں سنا نہ کرتے ہم

اگر نہ ہاتھ میں اس دلربا کے دل دیتے
تو دل پہ ہاتھ سدا دھر لیا نہ کرتے ہم

اگر نہ دام میں زلفِ سیہ کے آ جاتے
تو یوں خراب و پریشاں رہا نہ کرتے ہم

اگر نہ لگتی چپ اس بدگماں کی شوخی سے
تو بات بات میں مضطر ہوا نہ کرتے ہم

اگر جلاتے نہ اس شعلہ رو کے عشق میں جی
تو سوزِ آتشِ غم سے جلا نہ کرتے ہم

نہ جاتے اُس بتِ ہرجائی کی گلی میں اگر
تو دوڑے دوڑے قلق سے پھرا نہ کرتے ہم

اس آفتِ دل و جاں پر اگر نہ مر جاتے
تو اپنے مرنے کی ہر دم دعا نہ کرتے ہم

نہ بھرتے دم جو کسی شعلہ رو کی خواہش کا
تو ٹھنڈی سانس ہمیشہ بھرا نہ کرتے ہم

اگر نہ آنکھ تغافل شعار سے لگتی،
تو بیٹھے بیٹھے ہی یوں چونک اٹھا نہ کرتے ہم

نہ ہوش کھوتے اگر اس پری کی باتوں پر
تو آپ ہی آپ یہ باتیں کیا نہ کرتے ہم

اگر نہ ہنسنا ہنسنا نا کسی کا بھا جاتا　　تو بات بات پہ یوں رو دیا نہ کرتے ہم
اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت آہ　　تو ایک ایک کے منھ کو تکا نہ کرتے ہم

۶۔ نظیری نیشاپوری کی ایک مشہور مسلسل غزل ہے ؎

چشمش برا ہے میرود مژگانِ نمناکش نگر　　در سینہ دارد آتشے پیراہنِ چاکش نگر

جیسا کہ مطلع سے ظاہر ہے اس غزل میں نظیری نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ اس کا محبوب خود کسی اور کا والہ و شیدا ہوگیا ہے۔ پوری غزل اُن واقعات کی ایک دلکش تصویر ہے جو ایسی حالت میں محبوب کو پیش آسکتے ہیں۔ غالباً اسی غزل سے متاثر ہوکر غالب نے بھی اسی زمین میں اسی مفہوم کی غزل لکھی ہے جس کا مطلع یہ ہے :۔

در گریہ از بس ناز کی رخ ماندہ بر خاکش نگر　　واں سینہ سودن از تپش بر خاک نمناکش نگر

کیفیتِ تغزل کے اعتبار سے نظیری کی غزل غالب سے بدرجہا بلند ہے۔ اُردو میں اس انداز اور اس معیار کی غزل جہاں تک مجھے علم ہے مومن کے سوا کسی اور نے نہیں لکھی۔ نظیری کی طرح مومن کی غزل بھی غالب سے برتر و بہتر ہے، مجھے اس غزل کے مطلع کا پہلا مصرع اور ایک شعر (سرمہ دینے لگتے ہو جس وقت رونا آئے ہے) کیونکہ میرے خیال میں مطلع کا پہلا مصرع "محض برائے بیت" کہا گیا ہے اور متذکرہ شعر کا مضمون غزل کے دوسرے اشعار سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اب آپ پوری غزل ملاحظہ فرمائیں اور اس پر مومن کے نقادوں کی خاموشی کا جس قدر ماتم کرسکیں کرلیں ؎

کیوں بنی خوں نابہ نوشی بادہ خواری آپ کی　　کس لئے ہے بے خودی، غفلت شعاری آپ کی
کیوں دم جانانہ کے بدلے ہے از خود رفتگی،　　کس لئے شوخی ہوئی ہے بیقراری آپ کی
منفعل ساز دم ناہید نغمے کیا ہوئے　　کیوں گزرتی ہے فلک سے آہ و زاری آپ کی
آشنا سے ہوگئے بیگانگی جاتی رہی،　　ہوگئی کس آتشی دشمن سے یاری آپ کی
بوئے گل سے ہو مکدر کس کی بو آئی ہے یاد　　خاک اُڑانے کیوں لگی بادِ بہاری آپ کی
عشقِ مہ رو میں تڑپتے ہو نہیں تو کس لئے　　جوں کتاں ہر شب قبا ٹکڑے ہے ساری آپ کی
مجھ کو حیراں دیکھ کر حیران رہ جاتے ہو کیوں　　ایسی محوِ یاس ہے امیدواری آپ کی
جی جلا جاتا ہے کیوں ہر لحظہ کس پر دل گیا　　لے گئی قابو سے جاں بے اختیاری آپ کی
کیوں ہے رنگ زرد پر گلگوں نہ اشک سرخ کا　　کس لئے ملنے لگی رنگت ہماری آپ کی
ہائے کیا بیتاب ہوکر دھر لیا سینے پہ ہاتھ　　کھل گئی مہوش کہے سے دلفگاری آپ کی
سُرمہ دینے لگتے ہو جس وقت رونا آئے ہے　　بارے ہے اب تک تو باقی شرمساری آپ کی
دل گیا دم پر بنی آنکھیں لڑیں کہتا ہے دل　　بیقراری، آہ و زاری، اشکباری آپ کی

کس صنم کی بندگی میں بُت پرستی چھوڑ دی
ہوگئی مومن کی سی کیوں دینداری آپ کی

مومن کی ایک مسلسل غزل ہے جس میں انھوں نے عاشقانہ مجبوریوں اور والہانہ بے اختیاریوں کی طرف بڑے دلکش پیرایہ میں اشارا کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے　　وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے
ٹھہری ہے کہ ٹھہرائیں گے زنجیر سے دل کو　　پھر برہمیٔ زلف کا سودا نہ کریں گے

گر آرزوئے وصل نے بیمار کیا تو، پرہیز کریں گے پہ مداوا نہ کریں گے
رکھ لیویں گے پتھر مگر اُن سنگ دلوں کو چھاتی سے لگانے کی تمنا نہ کریں گے
گر حسن گلو سوز نے پھر آگ لگائی، کیوں آب دم تیغ سے ٹھنڈا نہ کریں گے
جوں قبلہ نما گرچہ تڑپتے ہی کٹے عمر پر منھ سوئے دیر صنم آرا نہ کریں گے
اے حضرتِ مومن یہ مسلم جو ہے ارشاد بھولے سے بھی اب ذکر بتوں کا نہ کریں گے
لیکن جو بتوں نے ہی بھلا آپ سے کی بات پھر آپ ہی فرمائیں کہ کیا کیا نہ کریں گے

اسی زمین میں مومن کی ایک اور غزل ہے جو مسلسل نہیں ہے۔ اس غزل کا ایک شعر ہے :-

کیونکر یہ کہیں منتِ اعدا نہ کریں گے کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

نفسیاتِ محبت کا کتنا صحیح مطالعہ ہے اور اس کے اظہار میں کس قدر صداقت سے کام لیا گیا ہے۔

مومن کی ایک اور مسلسل غزل ملاحظہ ہو جو نہ صرف ان کی مسلسل غزلوں بلکہ تمام غزلوں میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہے۔ مومن کے متذکرہ نقادوں نے اپنے مضامین میں اس غزل کے متعلق کچھ کہنا تو درکنار کسی عنوان سے اس کا حوالہ اور اقتباس تک نہیں دیا۔ حالانکہ اس میں شک نہیں کہ یہ غزل مقبول عام ہونے کے ساتھ ساتھ مقبول خواص بھی ہوگی اور مومن کے نقاد بھی اس سے لطف اندوز ہوئے ہوں گے۔ اس غزل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی بنیاد مومن کے فلک پیما تخیل پر نہیں بلکہ اُن تجربات پر ہے جو اُن کو محبت میں پیش آئے یا جو محبت میں کسی کو بھی پیش آسکتے ہیں معاملہ بندی کا اس قدر دل آویز نمونہ دوسرے شعرا کے یہاں مشکل سے مل سکے گا ؎

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو تو اشارتوں ہی سے گفتگو وہ بیان شوق کا برملا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم گلۂ ملامت اقربا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمھارے جی کو بُری لگی تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا وہ نہیں نہیں کی ہر آں صدا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اب کچھ اور اشعار بغیر کسی تمہید و تشریح کے سنئے اور لطف اُٹھائیے ؎

دل لگانے کے تو اُٹھائے مزے جی بلا سے رہا نہ رہا
شبِ غم فرقت ہمیں کیا کیا مزے دکھلائے تھا دم رکے تھا سینے میں کم بخت جی گھبرائے تھا
یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکائے تھا تھے غلط پیغام سارے کون یاں تک آئے تھا
ہوگئی دو روز کی اُلفت میں کیا حالت ابھی مومن وحشی کو دیکھا اس طرف سے جائے تھا

کیا خجل ہوں اب علاج بے قراری کیا کروں
دھر دیا ہاتھ اس نے دل پر تو بھی دل دھڑکا کیا

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام اُس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

کس دن تھی اس کے دل میں محبت جواب نہیں
سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

یہ کسی سے ہو کہ ان کے لطفوں پہ گستاخی نہ ہو
غیر ہم ساکب ہوا ہر چند ہم سا ہو گیا

شعلۂ دل کو ناز تابش ہے
اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

آنکھیں جو ڈھونڈتی ہیں نگہ ہائے التفات
گم ہونا دل کا وہ مری نظروں سے پا گیا

بے جائے واں بنے ہے نہ بن جائے چین ہے
کیا کیجئے ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

اے دل وہ شوخ ستمگر تو یک طرف
پیغام لے کے بھی کوئی آیا نہیں ہنوز

کیا دکھ نہ دیکھے عشق میں کیا کیا نہ پائے داغ
زخموں پہ زخم جھیلے میں داغوں پہ کھائے داغ

لے شب وصل غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک

ڈوبا جو کوئی آہ کنارے پہ آ گیا
طغیان بحر عشق ہے ساحل کے آس پاس

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

ہے منتوں کا وقت شکایت رہی وہی
آئے تو ہیں منانے کو پر وہ عتاب میں

اے حشر جلد کر تہ و بالا جہان کو
یوں کچھ نہ ہو امید تو ہے انقلاب میں

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

صبح عشرت وہ نہ شام وصال
ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

عابد فریب شوخی و رغبت فزا نگاہ
میں کیا کسی سے صبر تجھے دیکھ کر نہ ہو

اعجاز سے زیادہ ہے سحر اُس کے ناز کا
آنکھیں وہ کہہ رہی ہیں جو لب سے بیاں نہ ہو

اک لحظہ نہیں قرار جی کو
موت آئے بس ایسی زندگی کو

یارب وصال یار میں کیونکر ہو زندگی،
نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

دستِ جنوں نے میرا گریباں سمجھ لیا
اُلجھا ہے ان سے شوخ کے بند قبا کے ساتھ

حال دل کیونکر کہوں میں کس سے بولا جائے ہے
سر اُٹھے بالیں سے کیا کچھ جی ہی بیٹھا جائے ہے

کہیں تو کیا کہیں اور بن کہے کیونکر روا ہووے
بڑی مشکل پڑی کیا چارۂ دردِ نہاں کیجے،

ہو کے آزردہ پشیماں ہوں کہ میں جس سے کہوں
وہی کہدے کوئی ایسے سے خفا ہوتا ہے

رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے
میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

گھر تو اس ماہ وش کا دور نہ تھا
لیک طالع نے نارسائی کی

شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چُرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

کیا کیا جواب شکوہ میں باتیں بنا گیا
لو اب بھی دل درست اُسی دل شکن سے ہے

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے
کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے

اُردو کی عشقیہ شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس میں عاشق اور محبوب دو الگ الگ خانوں میں بٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عاشق صرف عاشق ہے اور معشوق صرف معشوق۔ حالانکہ واقعات کی دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ جو عاشق ہے وہ محبوب بھی ہوتا ہے اور جو محبوب ہے وہ عاشق بھی۔ مومن کا یہ شعر اسی حقیقت کا اظہار ہے ؎

ہیں اسیر اس کے جو ہے اپنا اسیر ہم نہ سمجھے صید کیا صیاد کیا

لیکن افسوس یہ ہے کہ اُردو کے دوسرے شعرا کی طرح مومن کی شاعری بھی عاشق اور محبوب کے درمیان اُسی فرق کی آئینہ دار ہے جو صید و صیاد کے مابین پایا جاتا ہے۔ اُن کی شاعری کے مطالعہ سے اس نتیجہ تک پہونچنا ممکن نہیں کہ مومن صرف صید نہ تھے صیاد بھی تھے اور اُن کا محبوب محض صیاد نہ تھا صید بھی تھا۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ انھوں نے اپنے محبوب کے مرثیے میں اس قسم کے اشعار بھی کہے ہیں ؎

افسوس کوئی پردہ نشیں پردہ در نہیں وہ حُسن جس سے عشق ہو رسوا نہیں رہا
دل میں جگہ نہ ہونے کا کس سے گلہ کروں وہ قدر دانِ شکوۂ بیجا نہیں رہا

تو میرے دل میں بے اختیار یہ تمنا پیدا ہوتی ہے کہ کاش! مومن نے اپنی غزلیہ شاعری میں بھی اپنے محبوب کی وہی تصویر پیش کی ہوتی جو مندرجۂ بالا دو شعروں کے آئینے میں نظر آرہی ہے اگر انھوں نے ایسا کیا ہوتا تو وہ اُردو کی غزلیہ شاعری میں ایک زبردست انقلاب اور روایت کے بانی ہوتے۔

بہرحال مومن اُردو شاعری کے غیر صحت مندانہ روایات کا شکار ہونے کے باوجود جس حد تک صالح تغزل کا حق ادا کرسکے وہ ان کو اُردو کے چند بڑے غزل گو شعرا کی فہرست میں شامل کرنے کے لئے کافی ہے۔ اُردو شاعری میں ان کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ اُن کے کلام سے اُن کے بعد کے کئی شاعر متاثر ہوئے۔ حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فراق گورکھپوری وغیرہ کی شاعری مومن کے فیضان سے انکار نہیں کرسکتی۔

نظیر صدیقی

(نگار) جناب نظیر صدیقی کا یہ مقالہ بغیر کسی حذف و اضافہ کے شایع کیا گیا ہے، کیونکہ اول تو مقالہ نگار کی خواہش یہی تھی اور دوسرے اس لئے کہ اسوقت تک مومن کے متعلق جن جن حضرات نے جو کچھ لکھا ہے ان سب کا ذکر اس میں آگیا ہے اور میں خود بھی چاہتا تھا کہ یہ سب یکجا ہوجائے علاوہ اس کے یوں بھی مناسب نہ تھا کہ اگر کسی کو نقادانِ مومن کی رائے سے اختلاف ہے تو اس کو شایع نہ کیا جائے ۔ خیال تھا کہ نظیر صدیقی کے مضمون پر ایک تبصرہ کیا جائے، لیکن بعد کو یہ خیال ترک کردیا گیا، کیونکہ یہ بجائے خود ایک مستقل مضمون ہوجاتا اور اس سلسلہ کو زیادہ بڑھانا مناسب نہ تھا۔ جناب نظیر صدیقی نے مومن کی شاعری کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے، وہ اپنے استدلال کے لحاظ سے بعض جگہ یقیناً قابلِ قبول ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مومن کی جن کمزوریوں کو مقالہ نگار نے ظاہر کیا ہے، کیا مومن کے صحیح ذوق تغزل کا تعلق انھیں سے تھا۔ میر ایسے مسلم الثبوت غزلگو کے کلام میں بھی ہم کو متعدد اشعار ایسے ملتے ہیں، جو واقعتاً میر کے لئے ننگ ہیں، لیکن میر کا صحیح ذوق سمجھنے کے لئے ان کو نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ یہی حال دوسرے ساتذۂ فن کا تھا کہ انھوں نے جو کچھ کہا وہ بغیر انتخاب کے شایع کردیا اور لوگوں کو نکتہ چینی کا موقع مل گیا۔ غالب کا دیوان تو بڑی کانٹ چھانٹ کے بعد شایع ہوا، لیکن وہ بھی نحیف اشعار سے پاک نہ رہ سکا ۔ ایک نقاد کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ شاعر کے حقیقی ذوق کو معلوم کرے اور نظیر صدیقی نے ایسا نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں یہ بحث ضرور پیدا ہوتی ہے کہ ہم ایک شاعر کے طبعی میلان کا حال کیونکر معلوم کرسکتے ہیں جبکہ اس کے یہاں رطب و یابس سبھی کچھ پایا جاتا ہے، لیکن یہ مسئلہ زیادہ دشوار نہیں، کیونکہ ایک شاعر کا حقیقی رنگ وہی ہے جس کو وہ زیادہ کامیابی کے ساتھ پیش کرتا ہے اور اسی کو سامنے رکھ کر اظہار رائے کرنا چاہئے ۔ غالب کے کلام پر جب اظہار رائے کیا جاتا ہے تو انکے "بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہئے" کو کوئی سامنے نہیں رکھتا، اسی طرح اگر مومن کے رنگ سخن پر گفتگو کرنا ہو تو "فلس ماہی کے تلے شمع شبستاں ہوں لے" کو سامنے نہ رکھنا چاہئے ۔ مقالہ نگار نے اخیر میں مومن کے جس رنگ تغزل کو سراہا ہے وہی مومن کا اصلی رنگ ہے اور نظیر صدیقی کو وہی اپنے سامنے رکھنا چاہئے تھا۔

"دُنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے"

یہ بہت مشہور مقولہ ہے اور بالکل درست ہے - آج دُنیا میں بہت سی ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جن کو ہم بالکل نیا سمجھتے ہیں حالانکہ موجودہ علمی و اخلاقی دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پہلے نہ پڑ چکی ہو اور آج کے لوگوں نے اپنا چراغ پچھلے لوگوں کے چراغ سے روشن نہ کیا ہو۔

آجکل بھاپ کی قوت سے بہت سے کام لئے جاتے ہیں اور ریل گاڑیاں سب بھاپ ہی کی قوت سے چلتی ہے، لیکن یہ کوئی نیا انکشاف نہیں ہے قدیم زمانہ میں بھی بھاپ کی مدد سے پہیئے چلائے جاتے تھے، چھاپہ کے فن نے آج غیر معمولی ترقی کرلی ہے لیکن یہ فن بھی ہمارے اسلاف کو معلوم تھا اور مسیح کی پیدائش سے بہت پہلے روما کے کمہار برتنوں پر اپنا نام ٹائپ سے نقش کر دیتے تھے اور نویں صدی عیسوی میں توجین میں بلاک کے ذریعہ سے کتابیں چھاپنا بکثرت رائج تھا۔

قدیم اسکندریہ میں سڑکوں پر جا بجا ستون نصب کئے گئے تھے اور لوگ ان پر گوند سے اشتہار چسپاں کرتے تھے۔ اہلِ روما تو اپنے اشتہار بڑے بڑے تختوں پر بھی سُرخ اور سیاہ حرفوں میں دیتے تھے۔

اُر کے کھنڈروں سے پتہ چلتا ہے کہ عراق میں سُمیری لوگ بھی مسیح سے ۳۵۰۰ سال قبل نہ صرف اسفلٹ (ڈامر۔ تارکول) اور اسبستوس (Asbestos) سے کام لیتے تھے بلکہ مکانات کی تعمیر میں سیمنٹ اور کنکریٹ سے بھی کام لینا جانتے تھے۔

آگ بجھانے کا انجن سب سے پہلے مسیح سے ۲۰۰ سال قبل ایک یونانی شخص Ctesibius نے ایجاد کیا تھا اور مسیح سے ایک صدی قبل روم میں آگ بجھانے کے لئے ایک پورا عملہ مقرر تھا۔

قدیم زمانہ میں از خود کام کرنے والی مشینوں کا پایا جانا بھی تاریخ سے ثابت ہے، چنانچہ اسکندریہ کے مندر میں ایک مشین ایسی نصب تھی جس کے اندر سکّہ ڈالنے سے مقدس پانی کی ایک مقدار حاصل کی جاسکتی تھی۔ مصر میں طولمی بادشاہوں کے عہد سے پہلے مشینی آدمیوں، بھی وجود پایا جاتا تھا

نہ ٹوٹنے والا شیشہ بھی قدیم زمانہ میں ایجاد ہوچکا تھا جو چوٹ لگنے سے پچک جاتا تھا اور پھر ہتوڑی کے ضرب سے اس کی پچک دور کردی جاتی تھی۔ قدیم روما میں ایسا شیشہ بنانے کی صنعت عام تھی لیکن آج تک اس کا راز کسی کو معلوم نہیں ہوسکا۔

مصری مومیاؤں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ سن کے ریشوں سے کپڑا طیار کرنا وہاں کی بڑی اہم صنعت تھی۔ عہد نامۂ عتیق سے معلوم ہوتا ہے کہ کلیسا کے پردے اور پادریوں کے لبادے اسی کپڑے کے ہوتے تھے تین تین ہزار سال قبل کی جو مومیائی شدہ لاشیں اس وقت دستیاب ہوئی ہیں وہ اسی کپڑے میں لپٹی ہوئی ہیں درانحالیکہ کپڑے کی چمک اور اس کا رنگ جوں کا توں باقی ہے۔

اس وقت پارچہ بافی کے فن نے بڑی ترقی کرلی ہے لیکن قدیم مصر میں یہ فن اب سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اسوقت

تو مشین کے ذریعہ سے سوت مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ باریک کاتا جا سکتا ہے، لیکن قدیم مصری بغیر کسی مشین کی مدد سے اتنا ہی باریک سوت کات لیتے تھے۔

افلاطون نے ایک الارم گھڑی بنائی تھی جس میں ایک ٹیڑھی نلکی کے ذریعہ پانی تیزی سے آتا تھا اور سیٹی کی سی آواز اس سے پیدا ہوتی تھی۔ افلاطون اس الارم گھڑی کے ذریعہ سے اپنے شاگردوں کو صبح چار بجے جگایا کرتا تھا

قدیم مصر میں بیک وقت سات سات ہزار مرغی کے انڈوں سے گرمی پہونچا کر بچے نکالے جاتے تھے، حالانکہ اس وقت جو incubators اس غرض سے طیار کئے گئے ہیں وہ چند درجن سے زیادہ انڈوں کو گرمی نہیں پہونچا سکتے۔

وٹروویس (Vitruvius) جو ایک صدی قبل مسیح جولیس سیزر کے زمانہ میں پایا جاتا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ ایک برنجی ظرف ہوتا تھا جو تھیٹر کی دیوار کے سوراخوں میں لگا دیا جاتا تھا اور اس سے آواز ٹکرا کر زیادہ بلند ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اسٹیج کے پائیں میں بھی یہ آلات لگے رہتے تھے اور ان کے ذریعہ سے آواز زیادہ بلند ہو کر تماشائیوں کے کانوں تک پہونچتی تھی۔

فولاد میں پختگی اور لچک پیدا کرنے کا فن بھی قدماء کو معلوم تھا، چنانچہ اس وقت کی تلواریں اپنی تیزی اور صیقل کے لحاظ سے مشہور تھیں اور ان پر جو نشانات بنائے جاتے تھے وہ بالکل انمٹ تھے۔ قدیم ہندوستان میں بھی زنگ نہ کھا سکنے والا فولاد طیار کیا جاتا تھا، جس کا راز ابتک معلوم نہیں ہو سکا۔

ہاتھی دانت کو اُبال کر نرم کرنے کا راز بھی اب تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا حالانکہ قدیم زمانہ میں یہ بہت عام تھا۔

حماموں اور مکانوں کو گرم رکھنے کے لئے رومہ میں سنگی فرش کے نیچے گرم ہوا پھیلا دی جاتی تھی اور دیواروں کو بھی اسی طریقہ سے گرم کیا جاتا تھا۔

کلیساؤں کے پادری بھی عوام کو مرعوب کرنے کے لئے طرح طرح کی ترکیبوں سے کام لیتے تھے۔ مثلاً قربانگاہ کی آگ کو نلکیوں کے ذریعہ سے پھیلا دیا جاتا تھا اور دھات کی بنی ہوئی چھڑیوں سے چھچھانے کی آواز پیدا ہونے لگتی تھی۔ بعض کلیساؤں میں اوپر قبہ میں مقناطیس کا بڑا ٹکڑا لٹکا دیا جاتا تھا جو بُت کو اپنی طرف کھینچتا تھا اور اس میں حرکت پیدا ہو جاتی تھی۔

بعض کلیساؤں میں قربانگاہ کے پتھر کے نیچے ایک پوشیدہ حوض رہتا تھا جس میں زمین دوز نلوں کے ذریعہ سے پانی آتا تھا اور جب یہ پانی گرم ہو جاتا تھا تو وہ اُبل کر دوسرے ظرف میں چلا جاتا تھا اور پانی کے دباؤ سے کلیسا کے دروازے ازخود کھُل جاتے تھے۔

مصری کاہن بھی اپنے مندروں میں اس قسم کے معجزے دکھایا کرتے تھے۔ مندر کی دیواروں میں وہ بڑے بڑے مقعّر (Concave) شیشے لگا دیتے تھے، جن پر بُت کا عکس پڑ کر باہر کی طرف سب کو نظر آسکتا تھا۔

یونان میں اپالو دیوتا کا بُت جب سالانہ تقریب میں باہر نکالا جاتا تھا تو وہ فضا میں بلند ہو کر پھر نیچے آجاتا تھا اور یہ ایک گیس بھرے ہوئے غبارہ کی مدد سے کیا جاتا تھا۔

اس وقت صنعتی کارخانوں میں جہاں بڑے پیمانہ پر کام کیا جاتا ہے، کام کی تقسیم ہوتی ہے اور ہر کاریگر کے سپرد ایک مخصوص کام ہوتا ہے، یعنی یہ نہیں ہوتا کہ ایک کاریگر پوری چیز کو تنہا بنائے۔ عہد قدیم کے لوگ بھی اس سے

ناواقف نہ تھے، چنانچہ سنٹ اگسٹائن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد قدیم میں بھی یہی رواج تھا۔ مثلاً سنار کو کوئی چیز بنانا ہوتی تو اس کا سانچہ کوئی بناتا ڈھالتا کوئی، صیقل کوئی کرتا اور نقاشی کسی اور کے سپرد ہوتی اس طرح ایک ہی چیز مختلف ہاتھوں سے نکل کر پوری ہوتی۔

روزولٹ صدر امریکہ نے ۱۹۳۵ء میں غلّہ کا اسٹور جمع کرنے کا منصوبہ پیش کیا تھا تاکہ آڑے وقت یہ ذخیرہ کام آئے، لیکن یوسفؑ نے بھی مصر میں یہی کیا تھا جب وہ وہاں کے وزیر تھے۔ قدیم مصر میں نہ صرف غلّہ کا ذخیرہ محفوظ رکھا جاتا تھا، بلکہ مختلف اجناس کا ایک دوسرے سے تبادلہ، تقاوی، کاشت پر بیج اور غذائی اشیاء پر کنٹرول سب کچھ وہاں رائج تھا۔

غذائی اشیاء کو محفوظ رکھنے کا طریقہ بھی ان کے یہاں بڑا مکمل تھا۔ اس زمانہ کی محفوظ کی ہوئی مچھلیاں آجتک اچھی حالت میں پائی گئی ہیں۔ مصری لوگ مچھلیوں کو کسی خاص کپڑے میں لپیٹ کر صحرا کے آیوڈین ملے ہوئے پانی میں رکھدیتے تھے اور اس طرح وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوجاتی تھی

قدیم ہندوستان میں برف کے کھتّے رکھے جاتے تھے۔ جاڑوں کی رات میں چھوٹے چھوٹے گڈھے کھودکر پیال کے اوپر کچے پیالے مٹی کے پانی بھرکر رکھدئے جاتے تھے اور صبح کو جو برف پانی کی سطح پر جم جاتی تھی، اسے گڑھوں میں دبا دیتے تھے۔ اسکندر اعظم کے زمانہ میں بھی آسمانی برف کو بڑے بڑے تہ خانوں میں دبا دباکر بھر دیتے تھے اور وہ عرصہ تک قایم رہتا تھا۔ شہنشاہ نیرو سب سے پہلا شخص تھا جس نے شراب میں برف ڈالنے کی جگہ بوتل کو برف کے اندر رکھ کر ٹھنڈا کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔

ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ مصری امرا اپنے ہاتھوں کو سنگ مردہ (Quartz) کے ٹکڑوں سے مل ملکر ٹھنڈا رکھتے تھے اور جب وہ میانوں میں بیٹھ کر نکلتے تھے تو پہلے ان میں ترپتیاں اور پھول بچھا دئے جاتے تھے اور پھر ان پر ایک باریک چادر بچھادی جاتی تھی تاکہ گرمی نہ معلوم ہو۔

علاج کے سلسلہ میں بجلی سے قدماء بھی کام لیتے تھے۔ مثلاً دردِ سر میں ایک خاص مچھلی جس سے بجلی کی رو پیدا ہوتی ہے سر پر رکھدی جاتی تھی اور اس سے اعصابی درد دور ہو جاتا تھا۔ تین چار گھنٹے تک بیہوش رکھنے کے لئے ایک بوٹی مردم گیاہ (mandrake) کھلادی جاتی تھی۔ ایک اور بوٹی Henbam کی مدد سے ہر قسم کا اعصابی درد دور کیا جاتا تھا۔

ساحل دجلہ کھودنے سے جو قدیم گلی تختیاں برآمد ہوئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۷۰۰ سال قبل مسیح اسیریا کے ایک بادشاہ کے علاج میں مُلہٹی سے کام لیا گیا تھا۔ ۱۵۰۰ سال قبل مسیح کی جو گلی تختیاں ارض بابل میں دستیاب ہوئی ہیں ان میں مچھروں کا ذکر کرتے ہوئے ظاہر کیا گیا ہے کہ ان سے بخار پیدا ہوتا ہے۔

مصری لوگ آبپاشی کی نہروں کو گھاس پات سے صاف رکھنے کے لئے ایک چڑیا لقلق کے قسم کی پالتے تھے جو نہروں کی تہ میں آبی پودوں کو پھیلنے نہ دیتی تھی، اسی طرح اہلِ یونان میں طاعونی چوہوں کو فنا کرنے کے لئے سانپ پالنے کا رواج تھا۔

بیماریوں کا ٹیکہ لگانا بھی نئی چیز نہیں ہے قدیم ہندوستان اور چین میں اس کا رواج پایا جاتا تھا۔ اس وقت جسے فطری طریق علاج کہتے ہیں، وہ بھی بڑی پرانی چیز ہے۔ ۴۰۰ سال قبل مسیح بقراط ٹھنڈے پانی اور بارش کے پانی میں بٹھاکر اور بالو پر ننگے پاؤں چلاکر اکثر امراض کا علاج کیا کرتا تھا، اور اسی اصول کے پیش نظر موسیٰ طبیب نے

۲۳ سال قبل مسیح شاہ اگسٹس کو ایک سخت مرض سے شفایاب کیا

مصنوعی اعضا استعمال کرنے کا رواج قدیم زمانہ میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ انگلستان کے رایل کالج آف سرجنس میں ایک مصنوعی پاؤں محفوظ ہے جو ۳۰۰ سال قبل مسیح اٹلی کے ایک سپاہی کے لئے بنایا گیا تھا۔ پلاسٹر کے ہونٹ، ناک اور کان بنانا بھی انھیں معلوم تھا۔

یونانی اور رومی قدیم تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ غدود کے علاج و اصلاح سے وہ لوگ بھی واقف تھے اور مریض کو اُبلا ہوا پانی دیتے تھے۔

ہیرو ڈوٹس لکھتا ہے کہ ایران کا بادشاہ سائرس جب کبھی باہر جاتا تھا تو اُبلا ہوا پانی چاندی کی صراحیوں میں ہمیشہ اپنے ساتھ لے جاتا تھا اور نیرو نے تو بقول پلینی (Pliny) بغیر جوش دیا ہوا پانی کبھی پیا ہی نہیں۔

پمپائی کے کھنڈروں سے بعض ایسے آلات بھی نکلے ہیں جن سے زمانۂ قدیم میں نسوانی امراض کے علاج میں کام لیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جولیس سیزر کی پیدائش ہی ایک نازک عمل جراحی کے بعد ہوئی تھی۔

آسٹریا میں کلٹی قوم کے بعض کاسۂ سر ایسے دستیاب ہوئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان پر عمل جراحی کیا گیا تھا۔ سکندر کے عہد میں ۳۵۶ سال قبل مسیح، لاشوں کو چیر پھاڑ کر موت کا سبب دریافت کرنے کا رواج عام تھا اور ایک جرمن ماہر مصریات نے لکھا ہے کہ ۲۰۰۰ سال قبل مسیح مصریوں میں آنکھ پر نزول ماء کا آپریشن کیا جاتا تھا۔

مصر قدیم میں فن دندان سازی ( ) کا پایا جانا بعض مومیائی شدہ لاشوں سے ثابت ہوتا ہے، جن کے نہ صرف دانت بلکہ آنکھیں بھی مصنوعی ہیں۔

بال اُگانے کے لئے تیل میں رینڈی کے بیج کچل کر وہ لوگ عام طور پر استعمال کرتے تھے۔ شعاعوں کے ذریعہ سے علاج کرنا بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پلینی کے زمانہ یعنی پہلی صدی عیسوی میں جسمی امراض کا علاج بلور کے شیشوں سے شعاعیں گزار کر کیا جاتا تھا۔

ڈاکٹروں کو فیس دینے کا طریقہ بھی بہت پرانا ہے۔ پلینی لکھتا ہے کہ شاہی ڈاکٹر کی تنخواہ سالانہ ۲۷۵۰ پونڈ مقرر تھی اور پرائیویٹ طور پر اس سے بہت زیادہ آمدنی اس کو ہو جاتی تھی۔ گیلن مشہور رومی ڈاکٹر نے اپنی فیس ۵۰ پونڈ مقرر کی تھی۔

اکسیر چشم گورنمنٹ رجسٹرڈ

میں نے اکسیر چشم کا استعمال پابندی سے متواتر شروع کیا اور اپنے عزیزوں کو بھی کرایا اور اب بھی ۳½ ماہ سے اس کا استعمال جاری ہے میں اکسیر چشم کی افادیت کا اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر اعتراف کرتے ہوئے بہ وثوق یہ سطور سپرد قلم کر رہا ہوں کہ "اکسیر چشم" کی جو کچھ تعریف کتاب "آنکھوں کی روشنی" میں لکھی ہے وہ حقیقتاً صحیح ہے "اکسیر چشم" واقعی کیمیاوی حل کامل اور اسم بامسمّٰی ہے۔ "اکسیر چشم" کے خواص بیان کرنے میں مبالغہ سے قطعی کام نہیں لیا گیا ہے "اکسیر چشم" کے استعمال سے چونکہ میں خود چشمہ سے بے نیاز ہو چکا ہوں اس لئے میں ہر شخص کو یہ مشورہ دوں گا کہ وہ چشمہ کی ضرورت محسوس کر کے چشمہ کا عادی نہ بنے، چونکہ اس کا استعمال ضرر رساں ہے چشمہ حقیقتاً ضعف بصارت کو ختم نہیں کر سکتا۔ اس لئے چشمہ خریدنے کی بجائے مسلسل چند ماہ اکسیر چشم کا استعمال کریں اکسیر چشم کی قیمت ہیچ ہے۔ ناظرین احسن کو چاہئے کہ اپنی عزیز آنکھوں کی حفاظت کے لئے عزیزی دواخانہ رجسٹرڈ پرنسس بلڈنگ جے جے ہسپتال بمبئی ۳ کو ایک کارڈ لکھ کر کتاب موسومہ "آنکھوں کی روشنی" مفت طلب کریں اور ہر مرض چشم کے لئے اکسیر چشم کے اکسیری فوائد سے استفادہ کریں۔ صغیر احمد۔ اڈیٹر ماہنامہ احسن

قیمت اوسط شیشی نو روپے، بڑی شیشی گیارہ روپے دس آنے

فنِ تحریر کی تاریخ

(بہ سلسلۂ ماہ ستمبر)

حطّی رسم خط حطّی قوم ایشیائے کوچک اور شمالی شام میں تین ہزار قبل مسیح پائی جاتی تھی، اُس کے دارالحکومت دو شہر تھے، ایک کادیش اور دوسرے کارخیمش اہلِ مصر اور آشوریہ والوں سے لڑتے لڑتے حطّی حکومت کمزور ہوگئی۔ یہاں تک کہ سارگون دوم (آشوری حکمراں) نے ۷۱۷ ق۔م کارخیمش فتح کرکے حطّیوں کے سیاسی اقتدار کا خاتمہ کردیا۔

حطّی لوگوں کا تمدن کسی طرح بھی مصری یا آشوری تمدن سے کمتر درجے کا نہ تھا۔ اُن میں ایک قسم کی تصویری لکھائی کا بھی رواج تھا جس کے کتبے دسویں صدی ق۔م سے لیکر چھٹی صدی ق۔م تک پائے جاتے ہیں اور زیادہ تر کارخیمش۔ حماط اور حلب کے شہروں میں ملے ہیں۔ عموماً وہ پتھر کی سلوں پر اُبھرے ہوئے نقوش میں کندہ کئے گئے ہیں لکھائی کی دو قسمیں ہیں قدیم اور جدید۔ پرانے زمانے میں ہر چیز کی مکمل تصویر بنائی جاتی تھی لیکن بعد میں اُس کی مختصر صورت بنانے لگے۔

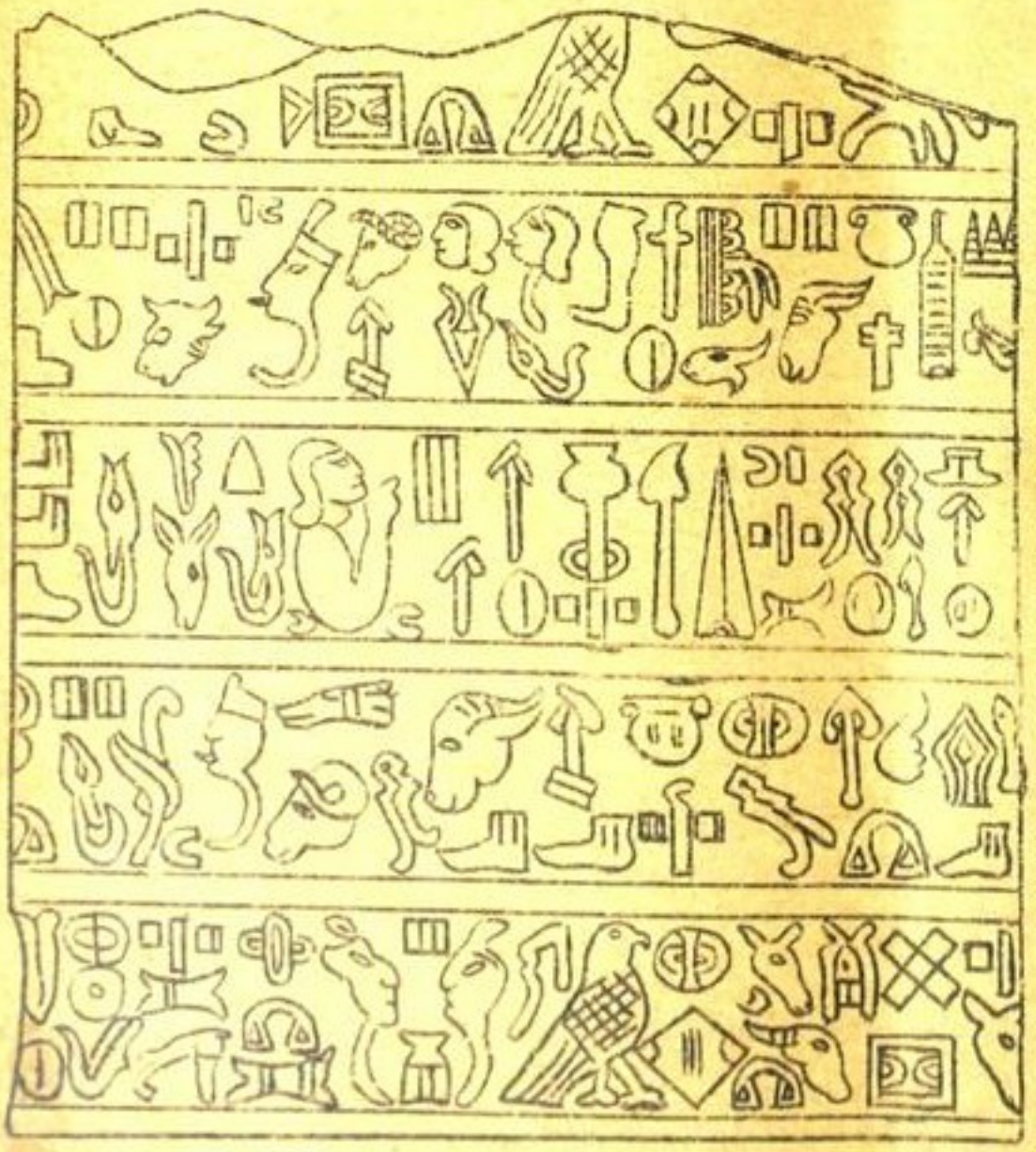

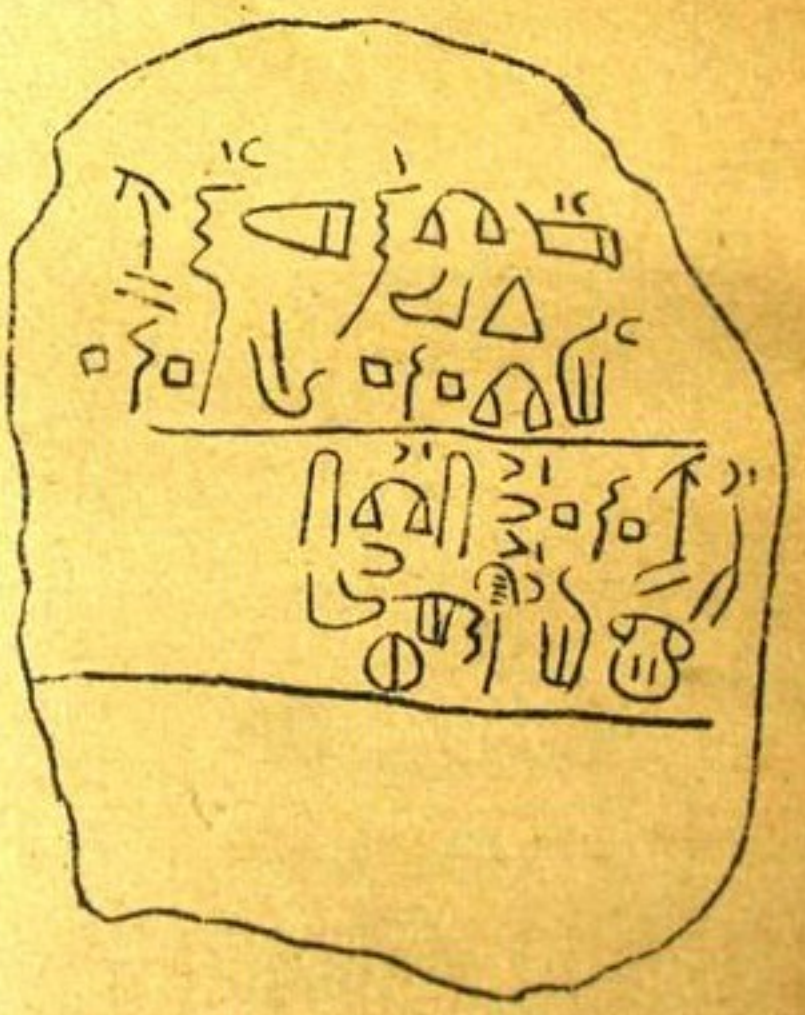

(حطّی رسم خط کے کتبے)

خطی رسم خط میں ایک سطر دائیں سے بائیں کو اور دوسری بائیں سے دائیں کو لکھی جاتی تھی (لکھنا دائیں طرف سے شروع کرتے تھے) اور اسی اعتبار سے حروف کے رُخ میں فرق ہوجاتا تھا یعنی جدھر سے لکھنا شروع کرتے اُدھر ہی انسانی اور حیوانی تصاویر کا منھ ہوتا۔

اس لکھائی میں تقریباً ۲۲۰ نشانات کام آتے تھے جن کی دو قسمیں ہیں ایک تو (LOGOGRAMS) یعنی وہ نشانات جو پورے الفاظ کا مفہوم ادا کرتے تھے اور دوسرے ارکان الفاظ (SYLLABLES) ان کی تعداد پروفیسر آئی۔ جے۔ گیلب کے مطابق ۶۰ ہے :-

	ا	ے	ی	و
حروف علت				
حروف غنہ				
خ				
ای	ایا			
گ ، ک				
ل				
م				
ن				
ب / پ				
ر				
س				
ش				
ت / د				
و				
ز (ص)				
"لفظ نامعلوم"				

خطی رسم خط کے پڑھنے میں ابھی تک پوری کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے بہت سے نشانات کی آوازیں اور

اُن کا مفہوم مشتبہ ہے۔ خوش قسمتی سے بعض ایسے کتبے موجود ہیں جن پر حطی رسم خط کے ساتھ ساتھ میخی رسم خط بھی پایا جاتا ہے جن کی وجہ سے اُنھیں کسی حد تک پڑھ لیا گیا ہے۔ ٹارکن ڈیمیس بادشاہ کی مہر میں جو چاندی کی بنی ہے ..... یہ دونوں رسم خط پائے جاتے ہیں بیچ میں بادشاہ کی تصویر ہے جس کے دائیں بائیں جانب ایک ہی حطی کتبہ ہے۔ اے۔ ای۔ کاؤلی کے مطابق میخی کتبے کا ترجمہ یہ ہے "میں ٹارکن ڈیمیس ہول شہر کی سرزمین کا بادشاہ" لیکن دوسرے عالم اسے اس طرح پڑھتے ہیں۔ "ٹارکن ڈیمیس شہر میتان کی سرزمین کا بادشاہ" (میتان سے میتانی قوم کی طرف اشارہ ہے)

حطی رسم خط کے بعض نشانات کریٹ کی لکھائی سے مشابہ ہیں اور اسی لئے بعض عالموں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کریٹ کی لکھائی سے ماخوذ تھا۔ لیکن یہ مشابہت اتفاقی بھی ہوسکتی ہے۔ علاوہ ازیں کریٹ کی لکھائی کو ابھی تک پڑھا بھی نہیں جاسکا ہے اس لئے اس بارے میں کچھ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا۔ میں ڈاکٹر ڈیوڈ ڈرینگر کے اس خیال سے متفق ہوں کہ حطی رسم خط مصر کی "خوبصورت لکھائی" سے متاثر ہوکر گھڑا گیا تھا۔

کریٹ کی لکھائی تقریباً ۳۰۰۰ ق۔م سے لیکر ۱۱۰۰ ق۔م تک کریٹ ایک خاص تہذیب کا مرکز تھا جس کے آثار سر آرتھر ایوانس نے ناسس (KNOSSOS) اور دوسرے شہروں میں کھود کر نکالے تھے۔ یہی تہذیب دوسرے جزایرِ ایجین اور یونان کے بعض حصّوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اُس کی نمایاں خصوصیت ایک خاص قسم کے تصویری رسم خط کا استعمال تھا جس کی حسب بیان ایوانس چار قسمیں تھیں:۔

۱۔ تصویروں کی لکھائی درجہ الف (PICTOGRAPHIC CLASS A) ۳۰۰۰ ق۔م سے کریٹ میں مہروں پر تصویری علامتیں نظر آتی ہیں جو غالباً آرائش یا امتیازی نشانات کے طور پر بنائی جاتی تھیں:۔

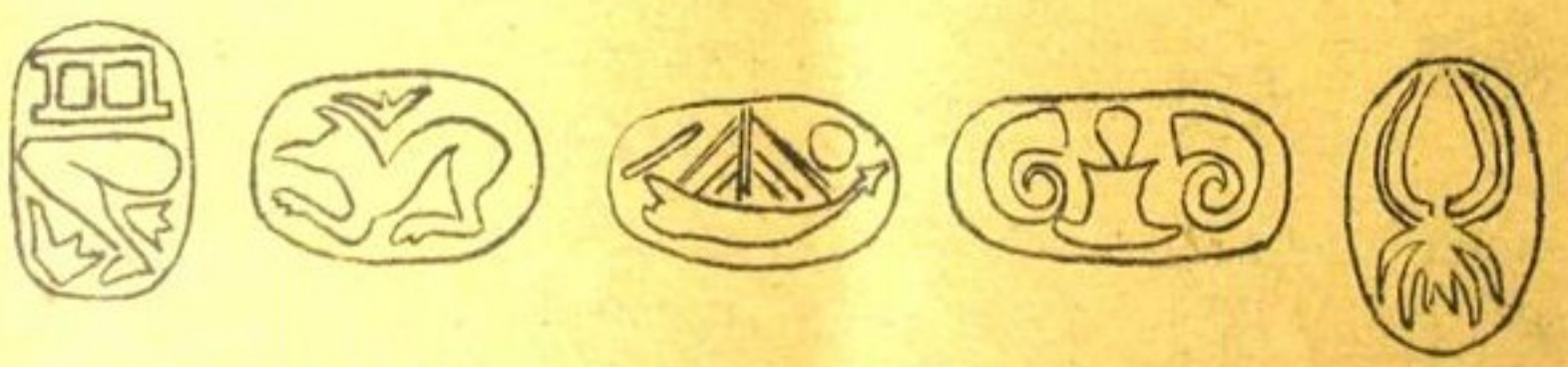

۲۰۰۰ لغایت ۱۹۰۰ ق۔م سے ایک مکمل تصویری لکھائی کا پتہ چلتا ہے جس میں ہر چیز کی پوری تصویر بنائی جاتی تھی۔

نیچے ایک چوپہل مہر کے دو رخ ملاحظہ ہوں :۔

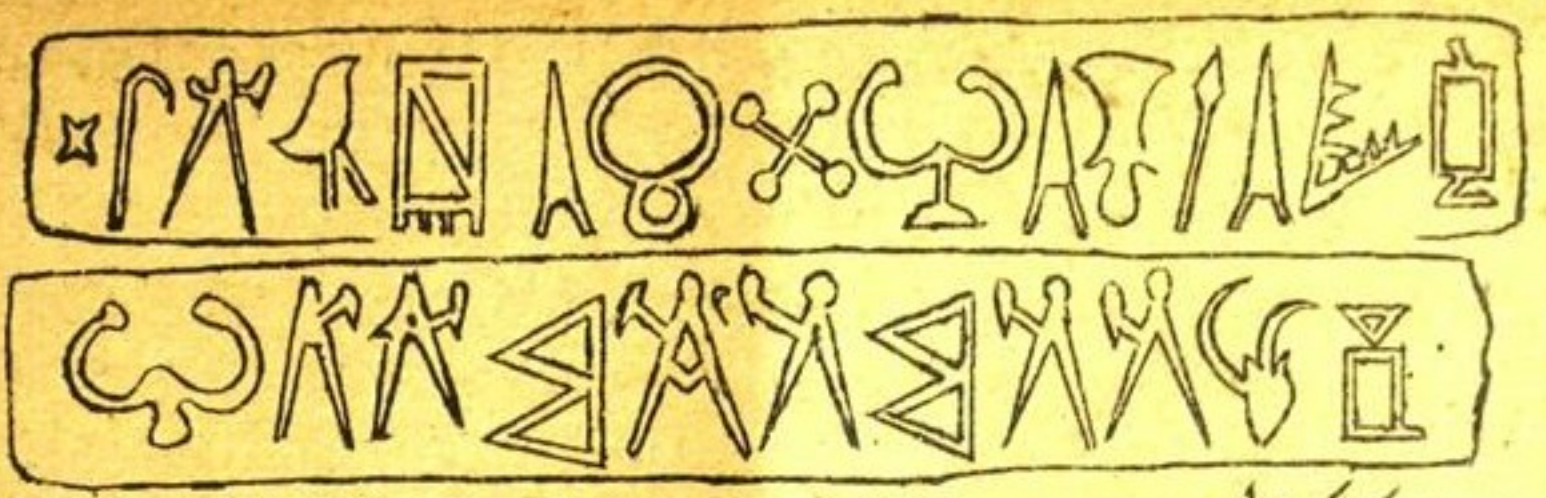

۲۔ تصویروں کی لکھائی درجہ ب (PIC TOGR APHIC CLASS B) جس کا آغاز تقریباً ۱۹۰۰ اور ۱۷۰۰ ق۔م کے درمیان ہوا۔ اس عہد سے تصویری علامتوں کو مختصر طور پر بنانے کا رواج ہوا۔ ایوانس کے بیان کے مطابق اس لکھائی میں تقریباً ۱۲۵ نشانات کام آتے تھے جو انسانوں، اعضائے جسم، آلاتِ حرب وضرب، پالتو جانوروں اور پیڑ پودوں کی تصاویر، مذہبی علامات اور اشکالِ ہندسہ پر مشتمل تھے۔

۳۔ لکیروں کی لکھائی درجہ الف (LINEAR CLASS A) جس کی ابتدا ۱۷۰۰ اور ۱۵۵۰ ق۔م کے درمیان ہوئی تصویروں کو مختصر کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ محض خاکہ ہو کر رہ گئیں اور ہر نشان لکیروں کا مجموعہ معلوم ہونے لگا۔ نشانات کی کل تعداد ایوانس کے بیان کے مطابق ۹۰ اور حسب بیان سنڈوال ۷۷ یا ۷۶ ہے۔ اس رسم خط کے کتبے قیمتی پتھروں، دھاتوں اور مٹی کے برتنوں پر پائے جاتے ہیں۔ لکھائی بائیں سے دائیں کو ہے۔

۴۔ لکیروں کی لکھائی درجہ ب (LINEAR CLASS B) جو ۱۴۵۰ اور ۱۳۰۰ ق۔م کے درمیان وجود میں آئی۔ اس میں تقریباً ۸۷ نشانات کام آتے تھے۔ اس کے کتبے مٹی کی تختیوں پر پائے جاتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ حساب کتاب سے متعلق ہیں۔

سامنے تصویروں کی لکھائی (۱) لکیروں کی لکھائی درجہ الف (۲) اور لکیروں کی لکھائی درجہ ب (۳) کی بعض علامتیں ملاحظہ ہوں :۔

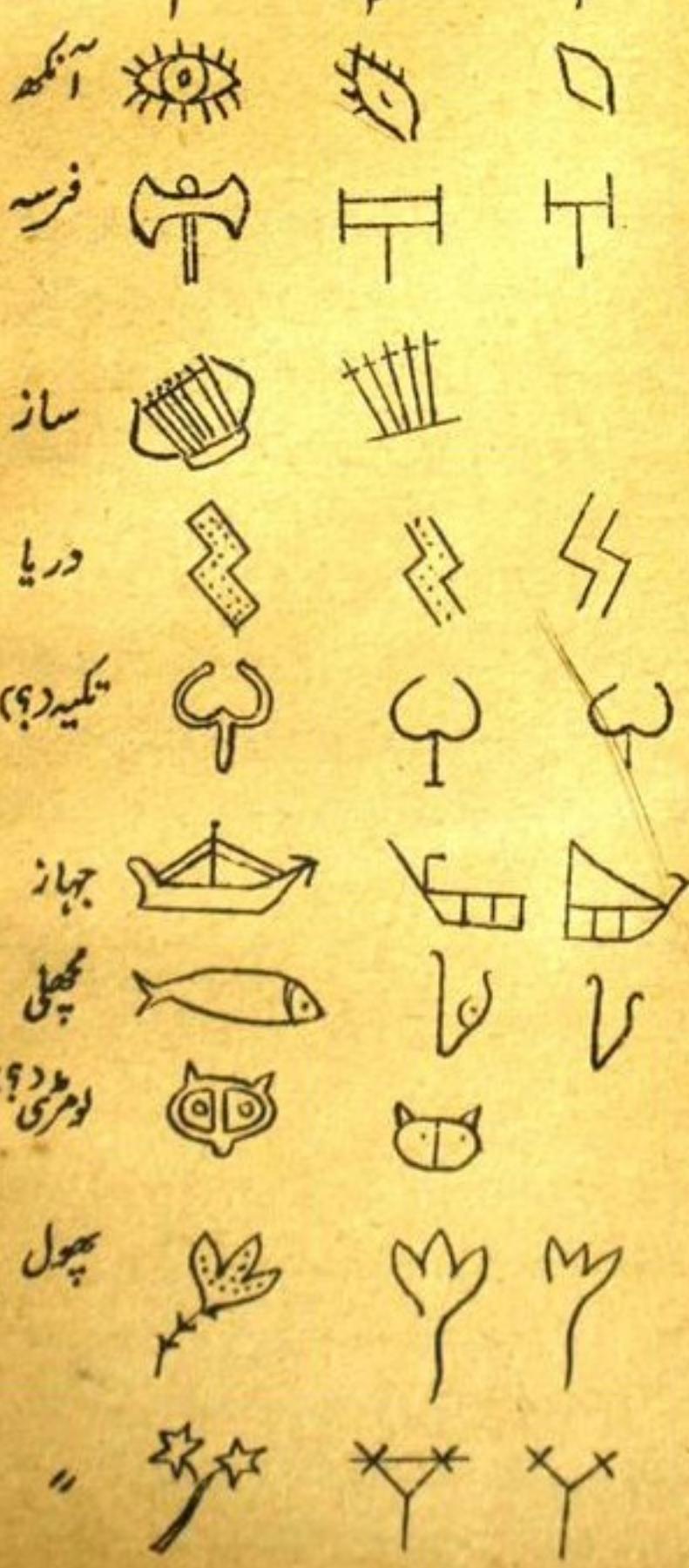

مذکورۂ بالا رسوم خط کو ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا ہے لیکن قیاس غالب یہی ہے کہ شروع میں کریٹ کی لکھائی تصاویر خیالی (IDEO GR APHS) پر مشتمل تھی اور بعد میں ارکانِ الفاظ کی لکھائی (SYLLABIC SC. RIPT.) میں بدل گئی۔

جہاں تک اُس کی ایجاد کا تعلق ہے عام رائے یہی ہے کہ کریٹ کے لوگوں نے تصویری رسم خط کا تخیل اہلِ مصر سے لیا لیکن اُس کے نشانات خود اہلِ کریٹ کی اپنی ایجاد ہیں وہ مصری ہیرو غلیفی رسم خط سے ماخوذ نہیں۔

قرصِ فائیسطس (PHAESTUS DISC) فائیسطس، کریٹ میں ایک مقام ہے۔ ۳ جولائی ۱۹۰۸ء کو وہاں سے مٹی کی ایک گول تختی برآمد ہوئی جس کا زمانہ ۱۷۰۰ ق۔م ہے۔ اس تختی کا قطر ۶-۷ انچ ہے اُس کے دونوں طرف ایک ایک چکر بنا ہے جو تختی کے ہر رخ کو پانچ حصّوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اس چکر کی لکیروں کے درمیان تصویری لکھائی ہے۔ ایک طرف ۱۲۳ اشکال ہیں اور دوسری طرف ۱۱۸۔ یہ کھڑی لکیروں کے ذریعہ بالترتیب ۳۱ اور ۳۰ کے مجموں میں منقسم ہیں جو الفاظ ہو سکتے ہیں:-

یہ تصویریں کریٹ کی مذکورۂ بالا لکھائیوں میں کام آنے والے نشانات سے بالکل مختلف ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی جداگانہ رسم خط ہے۔ لیکن چونکہ اس لکھائی کا کوئی دوسرا نمونہ کریٹ میں نہیں ملا، اس لئے بعض عالموں کا خیال ہے کہ یہ تختی کسی دوسرے ملک میں بنائی گئی تھی اور وہاں سے کریٹ آئی۔ لیکن اس طرح اس لکھائی کا مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ کسی بھی دوسرے ملک میں (جہاں تک تحقیق ہو سکی ہے) قرصِ فائیسطس سے مشابہ لکھائی کا رواج نہ تھا

قرصِ فائیسطس کو بہت سے عالموں نے پڑھنے کی کوشش کی لیکن ابھی تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے، البتہ چند قیاسات ضرور قایم ہو گئے ہیں مثلاً (۱) بعض تصویری لکھائیوں میں جدھر تصاویر کا رخ ہوتا ہے اُدھر ہی سے پڑھنا شروع کرتے ہیں قرصِ فائیسطس میں بھی یہی اصول برتا گیا ہے۔ یعنی اُسے کنارے سے وسط کی طرف پڑھا جائے گا۔ (۲) قرصِ فائیسطس میں کل ۴۵ تصاویر کو گھما پھرا کر استعمال کیا گیا ہے۔ چونکہ وہ ایک چھوٹا کتبہ ہے، اس لئے ہم فرض کر سکتے ہیں کہ اس لکھائی میں تقریباً ۶۰ تصویریں کام آتی تھیں۔ (۳) الفاظ کو ایک کھڑی لکیر سے جدا کیا گیا ہے۔ ہر خانے میں ۲ سے لیکر ۵ تک نشانات ہیں ہو سکتا ہے ہر نشان رکنِ لفظ (SYLLABLE) ہو۔ قرصِ فائیسطس میں سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اُس پر تصاویر کو کسی نکیلی چیز سے نہیں بلکہ ہاتھی دانت یا لکڑی کے ٹھپّوں کے ذریعہ دبا دبا کر بنایا گیا ہے۔

قبرص کا رسم خط چھٹی صدی سے تیسری صدی ق۔م اور اُس کے کچھ بعد تک جزیرۂ قبرص میں ایک خاص رسم خط رائج تھا جس میں تقریباً ۵۵ نشانات کام آتے تھے۔ جو ۵ حروفِ علت (VOWELS) اور

بقیہ حروف صحیح + حروفِ علت (OPEN SYLLABLES) پر مشتمل تھے جیسے کا۔ کے۔ کی۔ کو اور کُو وغیرہ ذیل کا نقشہ ملاحظہ ہو۔ اسے بائیں طرف کے حروفِ صحیح اور اوپر کے حروفِ علت ملاکر پڑھئے:۔

	ا	ے	ی	و	ؤ
حروف علت					
ی۔ ج					
ف و					
ر					
ل					
م					
ن					
پ					
ت					
ک					
س					
ز					
کھ					

اس رسم خط کے زیادہ تر کتبے یونانی زبان میں ہیں ..... قبرص کی زبان کا علم ہمیں نہیں ہے۔ کتبوں میں لکھائی کا رخ عموماً دائیں سے بائیں کو اور کبھی ایک سطر دائیں سے بائیں کو اور دوسری بائیں سے دائیں کو ہے اور یہ اصول سارے کتبے میں برتا گیا ہے۔

قبرص کے رسم خط کے ماخذ کے بارے میں اختلاف ہے (DR. DEECKE) کے مطابق وہ آشوری سے ماخوذ تھا، (PROFSAYCE) اُسے حتّی رسم خط سے ماخوذ سمجھتے تھے لیکن اب اُس کا تعلق کریٹ کی "لکیروں والی لکھائی" سے مانا جاتا ہے۔ اس کا ثبوت ایک نئے رسم خط کا انکشاف ہے جسے دونوں کے درمیان کی کڑی کہہ سکتے ہیں۔ اُس کا نام (CYPRO MINOAN) رکھا گیا ہے۔ اُس کے کتبے ۱۵۰۰ لغایت ۱۱۵۰ ق۔م کے ہیں لیکن قبرص کے رسم خط کا پتہ زیادہ سے زیادہ ۱۰۰۰ ق۔م سے چلتا ہے۔ دونوں کے بیچ کے زمانے کے کتبے کیوں نہیں ملتے اس کی توجیہ ابھی تک نہیں ہو سکی ہے۔

بائبلس کا رسم خط بائبلس، شام کا ایک شہر ہے۔ یہاں پر آثاری تحقیقات کرتے ہوئے (M. DUNAND) کو نو یا دس کتبے ملے جن میں سے چھ کانسے کی تختیوں پر ہیں اور باقی پتھر پر۔ یہ کتبے نیم تصویری رسم خط میں ہیں، اور آسمان، زمین، حیوانات، نباتات، مذہبی علامات، اشکالِ ہندسہ، جہاز رانی اور مختلف آلات وغیرہ کی تصویروں پر مشتمل ہیں ان میں سے تقریباً ۵۰ مصری ہیروغلیفی کے نشانات سے مشابہ ہیں اور بعض کی مشابہت کریٹ، قبرص وادیِ سندھ، سینائی یا کنعان وغیرہ کی لکھائیوں کے نشانات سے ہے۔

مشہور فرانسیسی مستشرق (PROF. E. DHROME) اس رسم خط کو پڑھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اُنکا کہنا ہے کہ کتبات کی زبان فنیقی (سامی) ہے اور اُن کا زمانہ فرعونِ مصر امینوفس چہارم کا عہد یعنی تخمیناً ۱۳۷۵ ق۔م۔ ایجاد کی تحریک غالباً مصری ہیرو غلیفی رسم خط سے ہوئی جس کے نشانات سے بابلس کی بہت سی علامتیں مشابہ ہیں نشانات کی آوازیں (SYLLABIC) قسم کی ہیں اور بہت سے نشانات ایک ہی آواز کے مظہر ہیں۔

چینی رسم خط کی تاریخ دنیا کے موجودہ رسوم خط میں بہت طویل ہے وہ تین ہزار سال سے ایک ایسی قوم میں لکھا جاتا رہا ہے جو یورپ سے بڑے ملک میں آباد ہے اور دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہے، گو مصری ہیرو غلیفی اور بعض دوسری لکھائیوں کے مقابلہ میں اُس کی عمر بہت کم ہے۔

پُرانے کتبے ۔چینی رسم خط کے قدیم ترین نمونے شنگ خاندان سے ملتے ہیں جسے ین بھی کہتے ہیں (زمانہ ۱۷۶۶ الغایت ۱۱۲۲ ق۔م) یہی چین کا پہلا حکمراں خاندان تھا۔ اس سے پہلے کی تاریخ محض روایات کا ایک دفتر ہے۔

شنگ زمانہ کے کتبات کانسے کے برتنوں۔ کچھوے اور دوسرے جانوروں کی ہڈیوں پر لاکھوں کی تعداد میں ین کے ٹیلوں سے برآمد ہوئے ہیں جو دریائے زرد کے شمال انیانگ کے قصبے اور ہونان کے صوبہ میں واقع ہے صرف کناڈا کے ایک شخص نے جو خاصکر اُنکی تلاش میں آیا تھا پچاس ہزار سے اوپر ہڈیاں برآمد کیں شنگ خاندان کے زمانہ میں شگون و فال کا بڑا رواج تھا۔ علم غیب کے مدعی لوگوں کے سوالات ہڈیوں پر تصویروں میں لکھتے تھے ان تصویروں سے قدیم چینی تمدن پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ہونان کی ہڈیوں پر پائی جانے والی بعض تصویری علامات ملاحظہ ہوں :-

ایجاد زمانۂ قدیم کے تصویری رسوم خط سے چینی رسم خط کا کیا تعلق تھا اس باب میں کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعض عالموں نے اُس کا سمیری رسم خط سے ماخوذ ہونا ثابت کرنا چاہا لیکن اُن کے نظریے کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ کیونکہ چینی رسم خط کا کوئی کتبہ ایسا نہیں ہے جو سمیری خط کی قدامت کو پہونچ سکے۔

نشانات کی تعداد شنگ خاندان کے زمانہ تک چینی رسم خط میں کام آنے والے نشانات کی تعداد کسی طرح بھی ۲۵۰۰ سے زاید نہیں تھی لیکن برابر نئے نئے نشانات وضع کئے جاتے رہے یہانتک کہ دوسری صدی ق۔م اُنکی تعداد ۳۰۰۰ تک پہونچگئی اور پہلی صدی عیسوی میں ۹۳۵۳ تک اور اب چینی رسم خط میں ۵۰۰۰۰ نشانات کام آتے ہیں لیکن ان میں بہت سے نشانات مرکب ہیں۔ مفرد نشانات کی تعداد کا صحیح علم نہیں ہے

قدیم صورت چینی رسم خط کا کوئی نشان ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں تحقیقات کی جائے اور وہ آخر میں تصویر نہ ثابت ہو بعض نشانات کی قدیم صورتیں ملاحظہ ہوں:۔

	جدید	قدیم		جدید	قدیم		جدید	قدیم
بھیڑ	羊		کنواں	口	井	سورج	日	⊙
کچھوا	龜		کتاب	冊	冊	چاند	月	☽
مچھلی	魚		شراب کا خم	壺	酋	پہاڑ	山	
سانپ	巳		تیر	矢	矢	دریا	川	
آدمی	人	大	کمان	弓	弓	درخت	木	
عورت	女		کلہاڑی	斤	中	پودا	禾	
بچہ	子		چڑیا	鳥	鳥	بارش	雨	
آنکھ	目		پنجہ	爪	爪	آگ	火	
کان	耳		ہاتھی	象		کشتی	舟	
منھ	口		گھوڑا	馬		رتھ	車	
دانت	齒		چیتا			چھت	宀	
ہاتھ	手		کتا	犬		پھاٹک	門	

(بقیہ صفحہ آئندہ) "ت" اور "ط" میں فرق ہونا چاہئے

پہلے چینی رسم خط بانس کے قلموں سے بانس کی تختیوں اور ریشم پر لکھا جاتا تھا۔ بعد میں موقلم (برش) استعمال کئے جانے لگے جس کی ایجاد منگ ٹی این (متوفی ۲۱۰ ق۔م) سے منسوب کی جاتی ہے جس نے دیوارِ اعظم بنوائی تھی لیکن بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا استعمال بہت پہلے سے تھا۔ آجکل بھی چینی رسم خط برش سے لکھا جاتا ہے۔ لکھنے کے لئے کالی روشنائی کا استعمال بہت قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہے

یہاں پر یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چینی رسم خط اوپر سے نیچے کو لکھا جاتا ہے۔ لکھنا دائیں طرف سے شروع کرتے ہیں۔

نشانات کی قسمیں ۔چینی رسم خط میں دو طرح کے نشانات کام آتے ہیں مفرد اور مرکب۔ مفرد نشانات کی مثالیں صفحہ ۲۴ پر ملاحظہ کیجئے۔ بعض خیالات کا اظہار مرکب تصاویر سے کیا جاتا ہے مثلاً :۔

	قدیم	جدید	
東			مشرق + مشرق = ہر جگہ
木			دو درخت = جنگل
女			دو عورتیں = جھگڑا
女女女			تین عورتیں = سازش
鳥			منھ + چڑیا = گانا
国			افضل + سلطنت = انگلستان
男			آدمی + پہاڑ = تارک الدنیا
日			سورج + افق = سویرا
安			دو ہاتھ = دوستی
家			عورت + گھر = امن و امان

ان نشانات کی مدد سے کیسے لکھا جاتا ہے اسے سمجھانے سے پہلے چینی زبان کی بعض خصوصیات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

چینی زبان کی خصوصیات

چینی زبان قواعد سے معرا ہے۔ اُس کا ہر لفظ ایک کلمۂ مفرد (MONO SYLLABLE) ہے جس میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ ایک ہی لفظ اپنے محلِ وقوع کے لحاظ سے اسم، فعل، صفت سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اور اوسطاً ہر لفظ کے دس معنی ہوتے ہیں جنمیں اندازِ تلفظ یا لہجہ کے اُتار چڑھاؤ سے تمیز کی جاتی ہے۔ یہی نہیں ملک چین میں ہزاروں بولیاں ہیں۔ ہر لفظ ہر جگہ ایک نئے انداز سے بولا جاتا ہے۔ ذرا سوچئے لکھتے وقت ان معنوں میں کیسے امتیاز کرتے ہوں گے؟ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ انگریزی زبان میں بہت سے الفاظ کا تلفظ ایک ہے مثلاً :۔ (RITE) معنی رسم (WRITE) معنی لکھنا (RIGHT) معنی صحیح اور (WRIGHT) معنی کاریگر بولتے وقت ان کے معنوں کا پتہ موقع استعمال سے چل جاتا ہے لیکن لکھتے وقت ہجے مختلف طریقوں سے کئے جاتے ہیں مگر چین میں ایسا نہیں کیا جاتا۔ اُنھوں نے اپنی مشکلات کا ایک دوسرا حل نکالا ہے یعنی ۲۱۴ نشانات ایک خاص طرح سے استعمال کرتے ہیں۔ اسے یوں سمجھئے کہ نیچے دئے ہوئے کل نشانات کو "چو" پڑھا جائے گا :۔

舟 舸 舒 炯 舟 舸 舟

بکواس تسلا ٹمٹمانا نرم روئیں جہاز

لیکن اس کے چھ معنی ہیں پہلا نشان (بائیں سے دائیں کو) جہاز کی تصویر ہے۔ دوسرے میں جہاز کی تصویر کے ساتھ "پر" کا نشان ہے۔ اس طرح تیسرے میں "آگ" کا چوتھے میں "پانی" کا اور پانچویں میں "لفظ" کا۔ اور پر کا تعلق روئیں سے، آگ کا ٹمٹمانے سے، پانی کا تسلے سے اور لفظ کا بکواس سے ظاہر ہے۔ گویا ان مثالوں میں ایک نشان سے آواز معلوم ہوتی ہے اور دوسرے سے معنی۔ ان معنی متعین کرنے والے نشانات کو "بنیادی نشانات" (RADICALS) یا کنجی (KEYS) کہتے ہیں۔ ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو۔

مندرجۂ ذیل کل نشانات کو "فنگ" پڑھا جائے گا:-

方 坊 房 紡 芳 訪 防 女 方

روکنا - پشتہ - حفاظت کرنا - دریافت کرنا - خوشبودار - کاتنا - کمرہ مقام - سڑک - مربع

لیکن اس کے دس معنی ہیں - پہلا نشان (بائیں سے دائیں کو) مربع کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ دوسرے میں مربع کے نشان سے پہلے "زمین" کا نشان بنایا ہے۔ تیسرے میں "دروازے" کا۔ چوتھے میں "ریشم" کا۔ پانچویں میں "جڑی بوٹی" کا چھٹے میں "لفظ" کا، ساتویں میں "ٹیلے" کا اور آٹھویں میں "عورت" کا۔ زمین کا مقام اور سڑک سے تعلق ظاہر ہے اسی طرح دروازے کا کمرے سے ریشم کا کاتنے سے، جڑی بوٹی کا خوشبو سے۔ لفظ کا دریافت کرنے سے، ٹیلے کا پشتے اور حفاظت کرنے سے اور عورت کا روکنے سے۔

اس طرح معلوم ہوا کہ چینی رسم خط میں کام آنے والے مرکب نشانات کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ جن میں دو تصاویر کو ملا کر ایک خیال ظاہر کرتے ہیں جیسے روشنی کے لئے سورج چاند کا بنانا اور دوسرے وہ جن میں سے ایک نشان آواز ظاہر کرتا ہے اور دوسرا معنی۔

چینی رسم خط کی بقا کا راز چینی رسم خط کا لکھنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ اس کے نشانات کی تعداد (پچاس ہزار) اتنی زیادہ ہے کہ انھیں یاد کرنے کے لئے انسان کی عمر ناکافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چینی لوگ تعلیم میں بہت پیچھے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پھر چینی رسم خط کیوں زندہ ہے اُسے وہاں کے لوگ ترک کیوں نہیں کر دیتے۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے اور وہ یہ (جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں) ملک چین میں ہزاروں بولیاں ہیں۔ لیکن سارے ملک کی تحریری زبان ایک ہے۔ جسے بین صوبائی حیثیت حاصل ہے۔

جاپانی رسم خط تقریباً تیسری صدی عیسوی میں بدھ مذہب کی اشاعت کے سلسلہ میں چین کے لوگ جاپان پہونچے اور اس طرح وہاں کے لوگ چینی رسم خط سے واقف ہوئے۔ اہل جاپان نے چینی رسم خط سے اپنی ضرورت بھر کے نشانات چن لئے جو مختلف الفاظ کو ظاہر کرتے تھے۔ ان نشانات کو انھوں نے بجائے چینی کے جاپانی ناموں سے پکارا مثلاً جنوب کو چین میں "نان" کہتے ہیں لیکن جاپانی میں "مینامی" لہذا جنوب کو ظاہر کرنے والے نشان کی آواز جاپان میں بجائے "نان" کے "مینامی" مقرر کی گئی۔ ایسے نشانات کو "کانجی" کہتے ہیں اور ان کی تعداد ہزاروں تک پہونچی ہے (صرف ابتدائی تعلیم میں کم از کم ۱۲۰۰ نشانات کا استعمال سیکھنا پڑتا ہے)

اسی سلسلہ میں چینی اور جاپانی زبانوں کے فرق کو بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، چینی زبان گرامر سے معرا ہے اور اُس کے الفاظ یک رکنی (MONO SYLLABIC) ہیں جن میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے جاپانی زبان کی گرامر ہے اور اُس کے الفاظ (POLY SYLLABIC) ہیں جن میں قواعد کے مطابق تبدیلی ہوتی ہے جیسے افعال کا زمانہ، صنعت کے مدارج، حروفِ جار، تذکیر و تانیث واحد اور جمع وغیرہ ظاہر کرنے کے لئے اصل لفظ میں مخصوص سابقوں اور لاحقوں کا اضافہ جنھیں لکھنے کے لئے جاپان کے لوگوں نے آٹھویں نویں صدی عیسوی میں دو رسوم خط ایجاد کئے جن کے نام ہیں کاٹاکانا اور ہیراگانا۔ ان دونوں میں کچھ فرق ہے۔ کاٹاکانا کے نشانات اُس چینی رسمِ خط سے ماخوذ ہیں جو بہت بنا بنا کر لکھا جاتا ہے (MODEL SCRIPT) اور ہیراگانا چینی خطِ شکست (CURSIVE SCRIPT) سے کاٹاکانا کے بعض نشانات کا ماخذ ملاحظہ ہو:۔

呂	末	天	巨	奴 چینی
لُو	مو	تین	ماؤ	نُو تلفظ
ریڑھ کی ہڈی	ختم	آسمان	بال	غلام معنی
ロ	マ	テ	モ	ヌ جاپانی
رُو	ما	تے	مو	نُو تلفظ

جزیرہ ایسٹر کا رسمِ خط

جزیرۂ ایسٹر، چلی (جنوبی امریکہ) کے مغربی ساحل سے ۲۵۰۰ میل کی دوری پر بحرِ پیسیفک میں واقع ہے اس کا رقبہ صرف ۷۰ مربع میل ہے یہاں کے لوگ رنگ روپ میں پولی نیشیا اور میلانیشیا کے لوگوں سے مشابہ ہیں اور غالباً وہاں سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ مقامی حکمرانوں کی فہرست سے حساب لگا کر اُن کی ہجرت کا زمانہ بارھویں، تیرھویں صدی عیسوی قرار دیا گیا ہے۔ اُن میں ایک تصویری رسمِ خط کا رواج تھا جسے "رونگو - رونگو" کہتے تھے۔ اُسے شارک مچھلی کی دانت سے لکڑی کی تختیوں پر کندہ کیا جاتا تھا۔ ۱۸۶۴ء میں جب کیتھولک مبلغین جزیرۂ ایسٹر پہونچے تو انھوں نے بہت سی تختیوں کو جلا ڈالا۔ بہرحال اب بھی ۱۵ تختیاں موجود ہیں جو مختلف ناپوں کی ہیں۔ (اُن کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ۶ فیٹ ہے) ان پر پائی جانے والی تصاویر میں انسانوں، مچھلیوں اور پرندوں وغیرہ کو بہ آسانی پہچانا جا سکتا ہے لکھائی کے رُخ میں ایک عجیب بات ہے یعنی ایک سطر کے

وادیِ سندھ (۱) اور جزیرہ ایسٹر (۲) کے نشانات کا مقابلہ

نشانات سیدھے ہیں اور دوسرے کے اُلٹے (معکوس) اور یہی اصول ساری تختی میں برتا گیا ہے جس کی بناء پر ہر ایک سطر ختم ہونے کے بعد دوسری سطر پڑھنے کے لئے تختی کو اپنی طرف گھمانا پڑتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جزیرہ ایسٹر کے نشانات کی آوازیں مقرر نہ تھیں اور اس لئے اُنھیں پڑھا نہیں جاتا تھا بلکہ دیکھا اور سمجھا جاتا تھا اور مذکورہ تختیاں ایک قسم کی یادداشت تھیں جن کا مفہوم وہاں کے لوگوں کو یاد نہیں۔ لیکن کہتے ہیں اُن میں خاندانی شجروں، باہمی لڑائیوں، مذہبی رسومات اور بھجن وغیرہ ہیں روایات کے مطابق جزیرہ ایسٹر کے لوگ سال میں ایک دفعہ یکجا ہوتے تھے اور اُنھیں یہ تختیاں پڑھکر سنائی جاتی تھیں۔ یہ کام ایک خاص طبقے کے سپرد تھا جس کے افراد "ٹنگٹا رونگو رونگو" کہلاتے تھے۔ ۱۸۶۳ء میں پیروکے بردہ فروش جزیرہ ایسٹر کے کل بڑے بڑے لوگوں کو گرفتار کرلے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی بھی اس رسم خط کا جاننے والا نہ رہا۔

اس سے قبل ہم ہنگری کے عالم جی۔ ڈی ہیوینری کے اس حیرت انگیز انکشاف کا ذکر کرچکے ہیں کہ وادی سندھ اور جزیرہ ایسٹر کے رسوم خط میں گہرا تعلق ہے اور دونوں کے نشانات بھی مشابہ ہیں (ساتھ کا نقشہ ملاحظہ ہو) لیکن یہ مشابہت اتفاقی معلوم ہوتی ہے۔

(باقی) محمد اسحاق صدیقی

اُڑن طشتریاں روس کی ایجاد ہیں

سوئٹزرلینڈ کے ایک ماہر ریاضی و فلکیات کا خیال ہے کہ تیسری عالمگیر جنگ آٹم بم یا ہائڈروجن سے نہیں لڑی جائے گی بلکہ اُڑن طشتریوں سے لڑی جائے گی، جو ہوا اور پانی کا طوفان پیدا کرکے دشمن کو شکست و پسپائی پر مجبور کردیں گی۔

اس پروفیسر کا نام جین لوئی نکولٹ ہے۔ اس نے ایک انٹرویو میں یقین دلایا کہ "اُڑن طشتریاں" اسی زمین کی چیزیں ہیں اور موسمی حالات میں تغیر پیدا کرنے کے لئے روس نے ایجاد کی ہیں ـــــ اُڑن طشتریوں کا حال اب سے صرف دو سال پہلے معلوم ہوا تھا اور پروفیسر نے جو شہادتیں اپنے نظریہ کے ثبوت میں فراہم کی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ پچھلے دو سال کے اندر دُنیا کے موسموں میں جو تغیر پیدا ہوا ہے اس کا باعث یہی ایجاد ہے ـــــ پروفیسر مذکور کا کہنا ہے کہ اس مدت میں عناصر آب و باد کے اندر جو تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں وہ سخت خطرہ کا پتہ دیتی ہیں ـــــ حال ہی میں جو طوفان برطانیہ، بلجیم اور ہالینڈ میں آیا تھا اور جس نے ہزاروں جانیں لے لیں، اس کا سبب بھی پروفیسر مذکور نے انھیں اُڑن طشتریوں کو قرار دیا ہے۔ اس نے ظاہر کیا کہ اس دوران میں دُنیا کے اندر غیر معمولی موسمی تغیرات پیدا ہوئے، مثلاً سرما میں تقریباً ہر جگہ بجلی کی کڑک، بحرِ سیاہ کے ساحلوں پر برفباری، اسپٹزبرجن میں غیر معمولی بارش، اسرائیلی حکومت میں اولوں اور برف کا طوفان، یہ سب انھیں طشتریوں کا نتیجہ تھا۔

پروفیسر مذکور کا بیان ہے کہ یہ طشتریاں روس ہی کی طرف سے آتی ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ خود سوویٹ حکومت میں کسی موسمی تغیر کی اطلاع نہیں ملی۔ وہ کہتا ہے کہ آیندہ جنگ میں ان طشتریوں کو کافی تعداد میں اُڑا کر سخت طوفان ابر و باد پیدا کرکے دشمن کے جہازوں کی پرواز کو ناممکن بنادیا جائے گا اور بم گرانے کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی ـــــ پروفیسر کا بیان ہے کہ یہ طشتریاں اوپر کی فضا میں ہیجان پیدا کردیتی ہیں اور اس ہیجان سے زمینی فضا میں طوفان ابر و باد پیدا ہوجاتا ہے۔

چند ماہ سے یہ طشتریاں نہیں دیکھی جاتیں اور اس کا سبب پروفیسر مذکور کے خیال میں یہ ہے کہ نیچی فضا کے لحاظ سے بڑی حد تک مکمل ہوچکی ہیں اور اب یہ ۶۰ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر پرواز کرتی ہیں، جہاں تک ہماری نگاہ نہیں پہونچ سکتی۔

اقبال سُہیل

اقبال احمد خاں سہیل، ہمارے صوبہ کے اُن چند افراد میں سے ہیں، جن کو قدرت نے غیر معمولی ذہانت عطا کی، لیکن ان سے وہ کام نہ لیا جس کے لئے وہ موزوں تھے۔ سہیل میں ایک بے مثل صحافی اور مصنف و ادیب بننے کی اہلیت تھی، لیکن وہ محض وکیل ہوکر رہ گئے اور اس طرح ہماری دنیائے علم و ادب ایک بڑی جنس گرانمایہ سے محروم ہوگئی۔

ہر چند ان کی ادبی عظمت، شاعرانہ اہلیت اور علمی گرانمایگی طبقۂ خواص سے پوشیدہ نہیں، لیکن عام پبلک انسے کم روشناس ہے۔ اس لئے ہمیں شکر گزار ہونا چاہئے، محمد حسن کالج جونپور کا جس نے اپنے میگزین کی ایک خاص اشاعت سہیل کے لئے وقف کردی اور کوشش کرکے ان کے اُردو و فاسی کلام کو یکجا کردیا۔ سہیل کیا ہیں اس کی وضاحت کے لئے چند مقالے بھی ابتدا میں شامل کردئے گئے ہیں۔

ذیل کے مقالہ میں سہیل کی زندگی کے اس پہلو کو پیش کیا گیا ہے، جسے صرف رشید احمد صاحب صدیقی ہی پیش کرسکتے تھے۔ اس کے بعد ہم پروفیسر سرور کا مقالہ شایع کریں گے جس میں سہیل کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ (نیاز)

مولانا سہیل، اقبال احمد خاں ایم، اے، ال، ال، بی (علیگ) سے میری ملاقات ۱۹۱۵ء میں ہوئی، اس زمانہ میں مولانا شاعری کرتے تھے، یونین کا الکشن لڑاتے تھے اور معجون کھاتے تھے، اب سنتے ہیں کہ صرف مقدمے لڑاتے ہیں اور بچے پیدا کرتے ہیں، جس کی ابتدا ایسی ہو اس کا انجام یہ کیوں نہ ہو، ہم دونوں گل منزل (یادش بخیر کچی بارک) میں تھے گرمیوں کا زمانہ تھا، لو چلتی تھی، خاک اُڑتی تھی، آپ نے معلوم نہیں گل منزل دیکھی بھی ہے یا نہیں، یہ بھی نہیں معلوم آپ مولانا سے بھی واقف ہیں یا نہیں، اس لئے اگر آپ کو ایک سے بھی شرفِ نیاز حاصل ہے تو سمجھ لیجئے آپ نے دوسرے کو بھی دیکھ لیا۔

مولانا ساکنِ گلِ منزل گلِ منزل متحرک، مولانا

جس دن مولانا سے ملا ہوں، مولانا الکشن میں مبتلا تھے، کچی اور پکی بارکوں میں یونہی کیا کم چشمک رہا کرتی تھی جب سے مولانا کچی بارک میں آگئے تھے، فریقین میں مقابلہ و مسابقت کا جذبہ خطرناک حد تک بڑھ گیا تھا، الکشن کا زمانہ قریب تھا، ہر طرف اسی کا چرچا تھا، مسجد، ڈائننگ ہال، یونین، کلاس روم، ہر جگہ، ہر وقت، ہر شخص اسی آشوب میں مبتلا تھا، ایک فریق کے ایجنٹ میرے کمرے میں بھی آگئے، مولانا کو خبر ہوئی، قاآنی کا ایک شعر گنگناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے، پانوں کی ڈبیا ہاتھ میں، پیک منہ میں اور اس کے دھبے شیروانی پر، کمرے میں بیٹھنے کی جگہ کہاں، بکس پر فریق مخالف کے ایجنٹ بیٹھے ہوئے اپنے امیدوار سے زیادہ میری قابلیت کا خطبہ پڑھ رہے تھے، مولانا بھی داخل ہوئے، کوئی جگہ بیٹھنے کو نہ ملی۔

کچی بارک کے غسل خانے معلوم نہیں آپ نے دیکھے بھی ہیں یا نہیں، نہانے سے پہلے ان غسل خانوں کی ستر پوشی لازمی تھی، ایسی ستر پوشی جس کے ہوتے ہوئے بھی بقول "حکیم حاذق"[1] بے غسلا، ستر شوئی بقدر اشک شوئی ہی کر سکتا تھا اور اس اعتبار سے ان غسل خانوں کا نظریۂ ستر نمائی مہوشانِ عہد حاضر کے تصور ستر پوشی کے قطعاً ہم آہنگ تھا میرے غسل خانے کی آبادی صرف ایک گھڑے پر مشتمل تھی، دوسرے کی جگہ خالی تھی، اس پر مولانا بلا تکلف اس طور پر بیٹھ گئے، گویا مولانا موصوف آج تک صرف اسی قسم کی نشست پر بیٹھنے کے عادی تھے، مجھ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا، یہ البتہ نہیں معلوم کہ اس گھڑے پر اس کا کیا اثر پڑا جس کے رفیق کی جگہ مولانا نے غصب کر لی تھی۔

اب میں تو الگ رہا، مولانا اور ان کے حریف میں گلچپ ہونے لگی، حریف نے آخر اس اعتراف پر بحث ختم کرنی چاہی کہ دونوں امیدوار احمق ہیں، مولانا نے برجستہ فرمایا تو جناب میرا احمق کیوں نہ ووٹ پائے۔

یہاں احمق کے بجائے دونوں بزرگوں نے ایک اور لفظ استعمال کیا تھا جو احمق سے زیادہ لچکدار، سریلا اور جامع تھا، لیکن اس کا اعادہ اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ پھر اسی قسم کے لوگ خاکسار کی عافیت میں خلل انداز ہوں گے، اُردو میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو اپنی جامعیت و معنویت کے اعتبار سے فقروں اور جملوں پر نہیں، بلکہ پوری داستان پر بھاری ہوتے ہیں، گفتگو میں وہ بے تکلف استعمال بھی ہوتے ہیں، لیکن ان کو تحریر میں لانا میرے بس کی بات نہیں۔

مولانا کا "محاربۂ الکشن" ایک خاص نظام کے تحت ہوتا، امیدوار کا انتخاب اکثر ذوقِ نظر کے تحت کرتے، گو یہ ذوقِ نظر محض رسمی یا شاعرانہ ہوتا اس کے بعد اس کا پروپگنڈا شروع ہوتا، مشاعرہ ہوتا تو غزل طیار کرتے، تقریر ہوتی تو تقریر لکھ دیتے، روپیہ کی ضرورت ہوتی تو اس سے بھی دریغ نہ کرتے، کسی مضمون میں نیاز مندی ہوتی تو درس دیتے، وہ کوئی حماقت کر بیٹھتا تو مولانا ثابت کر دیتے کہ اس سے بڑھ کر لیاقت اور ذہانت اگر کسی میں تھی تو خود ان میں تھی، نتیجہ یہ ہوتا کہ لوگ مولانا کے قایل اور ان کے پٹھو کے دشمن بن جاتے، اس سلسلہ میں مولانا کو اکثر خود ستائی پر بھی مجبور ہونا پڑتا، ایک دفعہ کسی دل جلے نے کہدیا مولانا آپ اپنا پروپگنڈا کرتے ہیں، کیسی شرم کی بات ہے، مولانا نے نہایت استغنا کے ساتھ جواب دیکر اس کو خاموش اور غضبناک تر بنا دیا، فرمایا "نبوت کا دعوے نہ کیا جائے تو آپ لوگ نبی کے کب قایل ہوں"۔

مولانا کالج میں فارغ التحصیل عیال دار کی حیثیت سے داخل ہوئے، ایف، اے پاس کر کے آئے تھے، بی، اے میں داخل ہوئے اور ایم، اے، ال، ال، بی ہو کر نکلے، چار برس کالج میں رہے، بورڈر تھے، لیکن تمام زمانہ دوسروں کے کمروں پر گزرا، دن کا تو کیا ذکر رات ہوئی جس کمرے میں ہوتے وہیں رات گزار دیتے، اب کمرے والے کو یا تو شعر سنا رہے ہیں، یا اس کے لئے کوئی نظم لکھ رہے ہیں یا اس کو اقتصادیات، فلسفہ، تاریخ، الٰہیات، فارسی، عربی، شعر و شاعری پر لکچر دیتے ہوتے، ورنہ پھر آم، پان، زمینداری، مذہب، عورتوں کی اقسام، مردوں کے امراض، مسلمانوں کے انجام پر خطبہ دیتے ہوتے، زائد چارپائی کا انتظام ہوا تو خیر، ورنہ کسی کے ساتھ چارپائی پر شکنِ بستر بن جاتے

---

[1] پروفیسر محمد حاذق صاحب کے ہم وطن ایک حکیم صاحب اکثر حاذق صاحب کے ہاں بطور مہمان نازل ہو جاتے تھے، بڑے لحیم شحیم، لمبا کرتا، لمبی داڑھی، لمبا عصا، کھانا کھانے اور پکانے کے بڑے شایق، جو کھانے پر مدعو کرتا اسے قرونِ اولیٰ کا مسلمان قرار دیتے تھے، جس سے ناراض ہوتے اسے "بے غسلا" کہتے تھے۔

ناظرین کو کہیں یہ اندیشہ نہ ہو کہ ان مباحث میں مولانا کی صرف بکواس ہوتی، ہرگز نہیں، جس مبحث کو اٹھایا یہ معلوم ہوتا تھا گویا ——— عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

انگریزی میں ذرا نیاز مند تھے، ریاضی سے دلچسپی تھی، سائنس سے قطعاً نا آشنا، ان کے علاوہ کالج میں درسیات کے سلسلہ میں جتنے مضامین تھے، ہر ایک پر پورا عبور تھا، جدید ترین نظریات سے آشنا تھے، مولانا کی ذہانت اور حافظہ کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ جس چیز کو انھوں نے عمر میں کبھی ایکبار بھی دیکھا یا پڑھا تھا اس پر ان کو اس درجہ عبور ہوتا تھا اور اس کی ادنیٰ جزئیات پر بھی اتنی قدرت ہوتی تھی کہ اس پر نہایت اعتماد کے ساتھ درس دے سکتے تھے، (مرشد ڈاکٹر ذاکر حسین خاں) کے قایل تھے، اکثر فرماتے تھے ڈاکٹر کی ذہانت اور فطانت تک پہونچنا آسان نہیں کیا کروں خرابی صحت نے مجھے برباد کر دیا ورنہ اس عمر میں میں بھی ایسا ہی تھا۔

بی، اے میں ذاکر صاحب کے مضامین، فلسفہ اور اقتصادیات تھے، ایف، اے میں سائنس، انٹرنس میں ریاضی کا نصاب اعلیٰ، مرشد کو پڑھنے لکھنے سے کیا سروکار، بی، اے میں حاضری کم تھی، ٹول صاحب نے بلا کر دھمکایا تو کتاب لیکر بیٹھے، کچھ دیر تک قرۃ العین کے اشعار ٹھیک اس انداز سے پڑھتے رہتے، جس سے بآسانی اندازہ ہوسکتا تھا کہ ایک پٹھان کے ہاتھوں قرۃ العین اور اس کے اشعار کا کیا حشر ہوسکتا تھا، اس کے بعد اپنے اور قرۃ العین کے انجام پر غور کرنے کے لئے لیٹ جاتے، اتنے میں مولانا کا نزول اجلال ہوتا، فرماتے مولانا اب جان کی خیر نہیں، پڑھنا شروع کیا ہے، لیکن قدم قدم پر مصنف کتاب سے اختلاف آرا ہوتا ہے اور یہ بھی طے نہیں کرسکتا کہ کون حق بجانب ہے، مولانا جواب دیتے "کوئی مضائقہ نہیں کتاب لاؤ"، کتاب لائی گئی، مولانا فرماتے ذرا اصل عبارت کا ترجمہ سناؤ، وہ بھی سنایا گیا، مولانا لاحول ولا قوۃ کہکر فوراً کرسی پر اکڑوں بیٹھ جاتے، تبصرہ شروع ہوتا، ثبوت میں مثالیں اپنی زمینداری یا علامہ شبلی مرحوم کی تصانیف سے دیتے، ذاکر صاحب کچھ دیر سنتے اور پھر کہتے بس بس سمجھ گیا، مولانا فرماتے دیکھو خواہ مخواہ جلدی نہ کرو، ابھی تو محض ابتدائی باتیں بیان کی ہیں، مصنف بڑا فریبی ہے، دیکھو اس کا فریب کھولتا ہوں، غرض نوبت یہاں تک پہونچتی کہ ذاکر صاحب بھاگ کھڑے ہوتے اور مولانا خواہ کسی حالت میں ہوتے ان کے پیچھے ہولیتے، اب وہ آگے چلے جارہے ہیں اور مولانا پیچھے پیچھے، جتنا فاصلہ دونوں کے درمیان بڑھتا جاتا مولانا اپنی آواز بلند کرتے جاتے، یہاں تک کہ ذاکر صاحب غائب ہوجاتے اور یہ پاس کے کمرے میں گھس جاتے، اب یقین مانئے وہ کمرہ خواہ کسی کا ہوتا، مولانا کا قیام آیندہ بارہ گھنٹے کے لئے وہاں مسلم ہوگیا - یہاں بھی مباحثہ کے لئے کوئی نہ کوئی موضوع اختیار کرلیا جاتا۔

میں کچی بارک کے ۲۷ نمبر میں تھا، جمعہ کا دن تھا، مولانا بھی موجود تھے، مولانا کے غسل کا انتظام کیا جارہا تھا مولانا کو غسل اور غیر نپی سے ہمیشہ نفرت رہی، لیکن آج لوگ کچھ اس درجہ آمادۂ نقض امن ہوئے تھے کہ مولانا جی کڑاکے کے نہانے پر آمادہ ہوگئے تھے، صرف ایک چھوٹی سی میلی بنیائن اور اس سے زیادہ میلا آڑا پائجامہ فریب ستر بنے ہوئے تھے، کثیف کمربند صاف پائجامہ میں پڑچکا تھا اور میلے پائجامہ کے نیفہ کو تہبند کی سی بندش سے گرفتار کر رکھا تھا، جس کو مزید کمک فتق کی کمانی سے پہونچائی گئی تھی، اتنے میں کھانا آگیا، مولانا نے کہا کھانے کے بعد فوراً نہالوں گا، ابھی مولانا ایک نلی (ہڈی) سے مناظرۂ دنداں نما کر رہے تھے کہ صاحب باغ سے کچھ لوگ آگئے، طہارت کے اسلامی اور غیر اسلامی تصور پر بحث چھڑ گئی، بحث کے انہماک میں مولانا کو یہ خبر بھی نہ ہوئی کہ جس چیز پر نلی ٹھونک کر موصوف گودا نکال رہے تھے، وہ غسل خانہ کا آستان تھا، لوگوں نے غل مچا دیا تو مولانا کو

خبر ہوئی، یہ موقع غنیمت تھا، نو واردوں نے رخصت ہوکر مسجد کا رخ کیا لیکن مولانا کی بحث ختم نہیں ہوئی تھی، اسلئے عالمِ بے خبری میں مولانا تعاقب کرتے ہوئے مسجد کے دروازہ تک پہونچ گئے، گداگر، مرد، عورت، بچے سب آفتِ ناگہانی سے اس درجہ سراسیمہ ہوئے کہ بچوں نے بوڑھیوں کا، بوڑھیوں نے بوڑھوں کا اور بوڑھوں نے اپنے چیتھڑوں کی کی پناہ پکڑی، اتنے میں ہم لوگ بھی دوڑ پڑے اور مولانا کو ایک زخمی فاتح کی حیثیت سے کمرہ پر واپس لائے۔

مولانا کو ہر کھیل سے دلچسپی تھی اور جسے جتنا کم جانتے تھے اتنا ہی اس سے زیادہ شغف تھا، تاش، چوسر، گنجفہ، شطرنج، کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، ٹینس، پولو، کہیں ہو رہا ہو، مولانا ضرور موجود ہوں گے اور اس تندہی اور دلچسپی کے ساتھ مصروفِ نظارہ ہوتے کہ دنیا و مافیہا کسی کی خبر نہ رہتی تھی، اس میں شک نہیں اس سلسلہ میں مولانا کا رعب اسی وقت تک قایم رہتا تھا، جب تک مولانا خاموش رہتے تھے، موصوف نے اظہار خیال کیا اور پکڑے گئے

مولانا صرف "اندرون خانہ" قسم کے کھیلوں میں براہ راست حصّہ لیتے تھے، تاش کھیلنے کا بھی شوق تھا، لیکن مولانا کے ساتھ کھیلنا ہر شخص کے بس کا نہ تھا، اول تو خراب کھیلتے تھے، دوسرے خلوص نیت سے نہ کھیلتے، ممکن ہے دوسری کمزوری پہلی کمزوری کی تلافی ہو!

مولانا کی شاعری پر اظہارِ خیال مرشد نے کیا ہے اور خدا جانے کیا اور کس طور پر کیا ہے، کیوں کہ نہ مجھ کو خبر کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں اور نہ ان کو خبر کہ میں کس آفت میں مبتلا ہوں، مجھے تو صرف یہ بتانا ہے کہ مولانا کی شعر و شاعری کے بعد ہم سب پر شاعر اور شاعری کا پھر کبھی رعب نہیں پڑا، کسی قسم کی شاعری ہو، مصرعۂ طرح کیسا ہی سنگلاخ کیوں نہ ہو، وقت کتنا ہی تنگ کیوں نہ ہو، اُردو ہو یا فارسی، مولانا کا قلم، بقول مولانا ظفر علی خاں صاحب "ٹھاٹھیں" مارتا چلا جاتا تھا، معلوم نہیں ٹھاٹھیں مارنے کی ترکیب کا یہ محل استعمال صحیح ہے یا نہیں، مفہوم بہرحال وہی ہے جو ظفر علی خاں صاحب کا رہا ہوگا، مولانا دوسروں کو غزل اور نظمیں لکھدیا کرتے تھے، اصلاح نہیں دیسکتے تھے، کہتے تھے جب تک اصلاح دوں پوری نظم کیوں نہ لکھدوں۔

لیکن مولانا سے شعر لکھا کر مشاعرے میں پڑھنا بیحد خطرناک تھا، مشاعرے میں کبھی تو مولانا اپنے یا اس کے کلام پر بآواز بلند سوچنا شروع کر دیتے تھے یا پھر ان کا پیچ و تاب یا اظہارِ جذبات اس درجہ نمایاں اور معنی خیز ہوتا کہ لوگ فوراً تاڑ جاتے کہ فی الاصل مصنفِ کلام کون ہے، اس لئے جو شخص مولانا سے استفادہ کرتا وہ اس کا بھی اہتمام کرتا کہ جس موقع پر وہ کلام پیش کیا جائے وہاں مولانا موجود نہ ہوں، مولانا کا کلام مولانا ہی کے تخلص سے تقریباً نایاب ہے، لیکن دوسروں کے تخلص سے اتنا ہی وافر ہے، جتنا کہ ذوق کا (بقول آزاد)

کالج میں ایک دفعہ غالب اور ذوق کا موازنہ نہایت مقبول عام "ادبی ورزش" تھی، ایک صحبت میں یہی مسئلہ زیر بحث تھا، ذوق کے پرستاروں کی تعداد زیادہ تھی، مولانا بھی گشت لگاتے پہونچ گئے، لوگوں نے مولانا کی رائے طلب کی، اتفاق سے مولانا کی طبیعت بحث پر مایل نہ تھی، حاضرین نے چھیڑنا شروع کیا، لیکن مولانا برابر "غیر حاضر" رہے، ایک صاحب نے ذرا فاتحانہ انداز سے ذوق کا یہ شعر پڑھا ؎

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

مولانا چونک پڑے، فرمایا سبحان اللہ! آپ ذوق سے بھی زیادہ کھرے نکلے، اس کے بعد خود شعر پڑھا اور ثانی مصرعہ کے ایک لفظ کو دو حصوں میں تقسیم کرکے پڑھ دیا اور سر نیچا کرکے لاحول ولا قوۃ کہدیا، ذوق کے سارے علمبردار خفیف اور خجل ہوکر اُٹھ گئے۔

ہاں تو تذکرہ تھا مولانا کے کلام کی کمیابی اور نایابی کا، حال ہی میں کسی اخبار میں اشتہار دیکھا گیا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ مولانا کا دیوان زیر ترتیب ہے، اس لئے جن صاحبوں کے پاس مولانا کا کوئی کلام ہو وہ مرتب کے پاس بھیجدیں، اس سلسلہ میں دو باتیں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں، ایک تو مولانا کی یہ کوشش اور تمنا کہ وہ کلام بھی دیوان میں شامل کرلیا جائے جو مولانا نے اپنی کسی خاص کمزوری کے تحت "وقف علی الاولاد" سا کردیا تھا اور دوسری طرف ان لوگوں کی سراسیمگی جو ان سے مستفید ہوئے تھے اور اب بدحواس ہیں کہ کہیں واقعتاً مولانا ایسا کر نہ بیٹھیں!

ایک صاحب مولانا کے نہایت عزیز دوست تھے، انھوں نے مولانا سے فرمایش کی کہ میں یونین میں ایک تقریر کرنا چاہتا ہوں، آپ ایک نہایت معرکۃ الآراء تقریر لکھدیں، مولانا فوراً آمادہ ہوگئے، تقریر لکھ کر حوالہ کی گئی نہایت پرمغز، مدلل اور پرشوکت، الکشن کا زمانہ قریب تھا، اس زمانے میں ہر امیدوار کے لئے یونین میں اپنی تقریر کا سکہ جمانا لازمی ہوتا تھا، کئی ہفتہ بعد اسی مبحث کا نوٹس دیا گیا، جس پر مولانا نے تقریر لکھی تھی، اور محرک کا نام بھی وہی تھا، جس کے لئے مولانا نے تقریر لکھی تھی، مقررہ یوم اور وقت پر ہم سب مولانا سمیت یونین پہونچے، وائس پریسیڈنٹ نے کھڑے ہوکر اعلان کیا کہ بعض وجوہ کی بنا پر محرک تشریف نہ لاسکے، اس لئے فلاں صاحب تحریک پیش کریں گے، یہ بزرگ مولانا کے دوست کے دوست تھے، لیکن مولانا ان کے ازلی دشمن تھے، مولانا کو کچھ تو اپنے دوست کے فرار ہونے پر خفت اور مایوسی تھی، کیونکہ حسب معمول ممدوح نے اپنی تصنیف اور اپنے دوست کی تقریر کا اپنے مخصوص انداز میں کافی پروپگنڈا کر رکھا تھا، دوسرے حریف کی پیشقدمی سے متحیر اور مکدر ہوئے، اب ممدوح نے نووارد کے خلاف طبع آزمائی شروع کی کہ یہ تقریر کرنا کیا جانیں، دو سطر عبارت تک صحیح لکھنا اور بولنا نہیں آتا، موضوع زیر بحث ان کے فرشتوں کے بھی سمجھ میں نہیں آسکتا، وغیرہ وغیرہ۔

محرک جدید حریف پارٹی کے رکن تھے اور بعض دیگر بنا پر ان کا شہرت پذیر ہونا مولانا کے مقاصد کے منافی تھا، تقریر شروع ہوئی، مولانا یکلخت چونک پڑے، یہ بزرگ نہایت خوبی اور بلند آہنگی کے ساتھ مولانا ہی کی لکھی ہوئی تقریر دہرا رہے تھے، اب مولانا کو معلوم ہوا کہ فریب دیا گیا تھا، ایسا فریب جس کی اہمیت اور نزاکت کو نظر انداز کیا گیا تو الیکشن کا سارا بنا بنایا نقشہ پلٹ جائے گا، تقریر ختم ہوئی اور سارا ہال ابھی نعرۂ تحسین لئے گونج ہی رہا تھا کہ مولانا اسٹیج پر نظر آئے۔

سارے حاضرین متحیر تھے کہ مولانا تقریر کرنے پر کیونکر آمادہ ہوگئے، مولانا کی جادو بیانی مشہور تھی، لیکن موصوف کو تقریر پر آمادہ کرنا ہر شخص کا کام نہ تھا، آج جو یہ آمادگی پائی گئی تو سارا مجمع فرطِ شوق سے ہمہ تن گوش بن گیا، مولانا نے تحریک کی مخالفت میں برجستہ کامل ایک گھنٹہ تقریر کی، اس عالمانہ تبحر، لطف بیان اور جوشِ خطابت کے ساتھ کہ لوگ حیرت میں آگئے، بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی، اس کے بعد سے لوگوں پر مولانا کے علم و فضل اور سحر بیانی کا ایسا سکہ جما کہ مولانا جب تک کالج میں رہے مولانا کے حریفوں نے بھی کبھی سرتابی نہیں کی، سرور خاں مرحوم زندہ تھے اور طلبائے کالج کی "جماعتِ اشراف" کے مسلّمہ لیڈر تھے اور مولانا سہیل اور ان کے "چوٹی والوں" کے سخت مخالف، ایک دفعہ مولانا کا تذکرہ آگیا، کہنے لگے "فتنہ ہے فتنہ" لیکن کیا کیا جائے کمبخت بڑا قابل ہے بے پناہ ہمہ دان ۔۔۔۔

۱۸ء یا ۱۹ء کا واقعہ ہے، یونین میں ام الالسنہ عربی پر خواجہ کمال الدین مرحوم کی اُردو میں تقریر تھی، خواجہ صاحب مرحوم نے نہایت بلاغت اور بالغ نظری سے تقریر شروع کی، مولانا سہیل کی آنکھوں میں تکلیف تھی، غالباً سردیوں کا زمانہ تھا، مولانا کو کچھ لوگ اسپتال لائے تھے، یونین میں مجمع دیکھا تو ساتھیوں نے کہا مولانا تکلیف نہ ہو تو

ذرا تقریر سننے چلیں، مولانا نے کہا اچھی بات ہے، لیکن آنکھوں میں تکلیف زیادہ ہے جلد اُٹھ آئیں گے، سب لوگ یونین میں آئے، مولانا سر سے پاؤں تک بڑے وزنی لبادہ میں ملفوف تھے، سر پر اونی کنٹوپ تھا، آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس پر ایک ہرے رنگ کا چھجا سا لگا ہوا تھا، خواجہ صاحب نے کم و بیش دو گھنٹے تقریر کی، حاضرین حیرت کے عالم میں وجد کر رہے تھے، تقریر ختم ہوئی تو ڈائس پر پریسیڈنٹ نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ مولانا سہیل فاضل مقرر کا طلبائے کالج کی طرف سے شکریہ ادا کریں گے، دوستوں اور ساتھیوں نے مولانا کو ہاتھوں ہاتھ منبر تقریر کے پاس کھڑا کر دیا، مولانا کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی، منبر کے پاس کھڑے کئے گئے تو معلوم ہوا کہ تھوڑی سی ناک اس سے ذرا بڑی ٹھوڑی اور ہاتھ کی صرف اُنگلیاں دکھائی دے رہی ہیں، مولانا نے برجستہ تقریر شروع کی اس اعتماد سے گویا موصوف نے تمام عمر اسی مبحث پر طیاری کی تھی، جو لوگ یونین کے مجمع سے واقف ہیں وہ جانتے ہونگے کہ اچھے مقرر کی تقریر کے بعد کسی اور کی تقریر سننے کے لئے کوئی نہیں ٹھہرتا اور صدر کا شکریہ بھی اسی بدنظمی کا ایک سلسلہ ہوتا ہے، مولانا نے بھی ام الالسنہ عربی پر تقریر شروع کی، مجمع ہمہ تن گوش ہوگیا، مولانا نے پون گھنٹہ تک تقریر کی، نئے نئے پہلوؤں سے موضوع پر روشنی ڈالی، نئی نئی مثالیں پیش کیں، اسلوب بیان حکیمانہ تر تھا تقریر کو اس درجہ دلنشین اور کہیں کہیں اتنا شگفتہ بنا دیا کہ خواجہ صاحب ممدوح بے اختیار ہو کر بغل گیر ہو گئے اور فرمایا "تمہارے ایسا جامع کمالات ساتھ کام کرنے والا مل جائے تو میں اسلام کا جھنڈا یورپ کی سب سے بلند چوٹی پر نصب کر دوں"

مسز سروجنی نائیڈو کالج میں پہلے پہل تشریف لائی تھیں، آج سے کم و بیش سترہ اٹھارہ سال قبل اسٹریچی ہال میں رات کے وقت تقریر ہوئی، وہ رات اُردو ادب اور ہندوستانی سیاست میں یادگار رہے گی، ہمارے "دو اسوبھا" آغا حیدر حسن دہلوی نے بیگماتی زبان میں بیگم نائیڈو پر ایک مضمون لکھا جو اپنی بعض خوبیوں کے اعتبار سے اُردو ادب میں بے نظیر ہے، دوسری نظم مولانا سہیل نے لکھی، معلوم نہیں وہ نظم دستیاب بھی ہوئی یا نہیں، ترکیب ترنم، لطافتِ خیال، تازگیِ تصور، لطفِ بیان، طرفگیِ تخیل میں وہ خود سروجنی کا پیکرِ شعری تھا اور تیسرے کہا جاتا ہے کہ اسوقت کے سکریٹری کالج کے "حُر بننے" کی شانِ نزول بھی اسی واقعہ سے وابستہ ہے!

مجھے مولانا کے کلام کا جائزہ لینا مقصود نہیں ہے، عام طور پر لوگ خیال کرتے ہوں گے کہ مولانا کی شعر و شاعری صرف اُردو تک محدود تھی، حالانکہ مجھے اکثر کچھ ایسا محسوس ہوا ہے کہ مولانا کے فارسی کلام میں اُردو سے زیادہ طرفگی اور تازگی ہے، اعلیحضرت شہریار دکن کے ورود مسعود پر مولانا نے جو فارسی قصیدہ اسٹریچی ہال میں سنایا تھا وہ مولانا کی فارسی دانی کا ادنیٰ ثبوت ہے، یہ قصیدہ مولانا نے رات بھر میں لکھ ڈالا تھا، اس کے علاوہ متعدد ایسی نظمیں ہیں جو ممدوح نے ڈائس پریسیڈنٹ یونین کی اورنگ نشینی کے موقع پر تصنیف فرمائیں، میں اب تک یہ نہیں طے کر چکا ہوں کہ مولانا فارسی نظمیں جلد لکھ سکتے تھے یا اُردو، بہر حال کچھ بھی ہو، لکھتے بہت جلد تھے، اتنا جلد کہ تصور میں بھی بہ مشکل آسکتا ہے۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ شہر سے کچھ لوگ آئے، ڈھونڈتے ڈھونڈتے مولانا تک پہونچے، مولانا کہیں جانے پر آمادہ ہیں لوگوں نے ہاتھ پاؤں جوڑنا شروع کر دیا، مولانا کھڑے کھڑے شعر لکھانے لگے، تھوڑی دیر میں نظم مکمل ہوگئی اور لوگ خوشی خوشی چلے گئے، ایک دن کا قصہ یاد ہے، مولانا قضائے حاجت کے بعد لوٹا لئے چیتا آفس یا جواہر منزل سے واپس آرہے تھے، کچی بارک کے کمرہ میں داخل ہی ہو رہے تھے کہ کچھ اجنبیوں نے وہیں پکڑ لیا، منظوم رقعۂ دعوت کی التجا تھی، مولانا بھی وہیں لوٹا لئے ہوئے اکڑوں بیٹھ گئے، پہلا مصرعہ لکھا یا تھا کہ ایک صاحب بول اُٹھے، حضور اُردو نہیں، فارسی

مولانا نے بغیر ایک لمحہ تامل کے فارسی شعر لکھانے شروع کردئے، فریقین کے نام، گاؤں، تاریخ سب کچھ نظم کردی، کیسی دلکش اور ستھری نظم تھی، میں نے کہا مولانا اسے علی گڑھ منتھلی میں شائع کراؤں گا، مجھے بھی لکھا دیجئے، فرمایا اب یاد کہاں اور پھر ایسی ویسی نظموں سے کون اپنے آپ کو منسوب کرے!

کتنے تو ایسے تھے جنھوں نے انعامی نظم اور مضامین نثر مولانا سے لکھوائے اور اول درجہ کا انعام حاصل کیا، ایک واقعہ یہاں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے، علی گڑھ کی نمائش قریب تھی، لکھنؤ کا ایک سفر درپیش تھا، اور کالج کے مطالبات مستزاد، ہم لوگ اس فکر میں تھے کہ کہیں سے روپے مل جائیں تو یہ سارے مرحلے کامیابی سے طے پا جائیں، ہم میں سب سے زیادہ مولانا دولت مند تھے، مولانا صرف کپڑے اور معجون پر روپے صرف کرتے تھے، یا ہم لوگوں کو قرض حسنہ دیتے تھے، قرض حسنہ کا مفہوم یہ تھا کہ اگر کبھی مولانا کو ضرورت ہو تو ہم روپئے ادا کریں، ورنہ کوئی ضرورت نہ تھی، مرشد نے اس میں سود کا اضافہ کردیا تھا یعنی بجائے اس کے کہ اصل پر سود کا اضافہ کرکے مولانا کو واپس کیا جاتا، ادا کرتے وقت اصل میں سے سود اور بھول چوک کی رقم وضع کرلی جاتی تھی، مولانا اس پر بھی اکتفا کرتے اور کہتے کہ جو کچھ مل گیا وہ پورا نفع ہے۔

اب یہ فکر ہوئی کہ روپے کہاں سے آئیں، رقم زیادہ تھی، مرشد نے فرمایا، مولانا کو ٹٹولو، میں نے کہا رقم زیادہ ہے، مولانا تو مان جائیں گے لیکن اس میں خرابی یہ ہے کہ وہ اس کے واپسی کے متمنی ہوں گے اور مولانا نے مانگا تو ہمارے ہاں ان کی ساکھ باقی نہ رہے گی، جو ان کے لئے اہم ہو یا نہ ہو، ہمارے لئے بہت اہم ہوگی، علوی نے کہا دیکھو ترکیب میں بتاتا ہوں، ابھی میں نے ایک نوٹس دیکھا ہے، اُردو کا ایک مضمون طلب کیا گیا ہے، اول انعام سو روپے کا ہے، مولانا سے لکھواؤ مضمون میں نام ہم اپنا دیں انعام تو مل ہی جائے گا، سو روپے مولانا سے قرض لے لئے جائیں، انعام ملے تو حق شاگردی وضع کرکے مولانا کو کچھ روپے واپس کردئے جائیں گے؟ یہ ترکیب پسند کی گئی اور پوری اسکیم مرتب کرکے ہم سب منھ لٹکائے مولانا کے پاس پہونچے۔

مولانا ہم لوگوں کو کبھی افسردہ خاطر نہیں دیکھ سکتے تھے، دیکھتے ہی بولے، خیر تو ہے، سست سست سے کیوں ہو بڑی دیر کے بعد علوی نے کہنا شروع کیا، مولانا وہ اشتہار تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا، جس میں سو روپے کا انعام مقرر ہے، مولانا نے کہا ہاں دیکھا ہے، لیکن موضوع بڑا مبتذل اور پیش پا افتادہ ہے، علوی نے کہا جی ہاں ٹھیک ہے، لیکن سرور صاحب نے آغا صاحب کے لئے..... صاحب کو لکھنؤ لکھا تھا اور وہاں سے وہ مضمون طیار ہوکر آگیا ہے، نہایت عمدہ لکھا گیا ہے، انعام تو خیر آغا کو مل ہی جائے گا لیکن آپ سمجھئے آیندہ الکشن پر اس کا کیا اثر پڑے گا، ہم لوگ تو کہیں کے نہ رہے، سرور صاحب کہتے تھے کہ انعام ملنے پر سہیل صاحب کی مزاج پرسی کروں گا۔ سنتے ہی مولانا نے جھرجھری لی، بولے سرور سے کہدینا، ستارۂ یمانی علی گڑھ سے بھی طلوع ہوسکتا ہے، اچھا تو ذرا میز پر سے سادی کاپی تو اُٹھانا، قلم تو تمھارے پاس ہے ہی، لکھو، اب مولانا نے مضمون لکھانا شروع کیا، بولے "بدو آفرینش سے" ہم لوگوں نے کہا مولانا یہ "بدو" وغیرہ مہمل ہیں، ذرا سیدھا سادھا لکھائیے، ایسا بھی کیا مضمون جس کا پہلا ہی لفظ نہ ٹھیک سے پڑھا جائے اور نہ سمجھا جائے، مولانا مسکرائے اور پھر لکھانا شروع کردیا، کم و بیش تین گھنٹے تک لکھاتے رہے، اس کے بعد دوسرے وقت کے لئے لکھائی ملتوی ہوئی، دوسرے دن مولانا نے پھر شروع کیا اور بغیر یہ پوچھے ہوئے کہ اوپر کیا لکھ آئے ہو، بولنا شروع کردیا، مضمون فلسکیپ کے تین صفحات پر ختم ہوا، نتیجہ جلد معلوم ہوگیا، اس لئے ہم لوگوں کو مولانا سے سو روپے نہیں لینے پڑے، انعام کے روپے ملے اور ہمارے پروگرام کی ایک ایک مد پوری ہوگئی۔

مولانا کی گھریلو زندگی اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے، مولانا اپنی تمام رشتہ دار عورتوں میں بیحد مقبول ہیں، عزیزوں کے تمام بیٹے بیٹیوں کی شادی کی بات چیت مولانا ہی کے ذمہ ہے، سال سال بھر کے قصے قضیے اس وقت تک کے لئے ملتوی رکھے جاتے ہیں جب تک تعطیل میں مولانا کا پھیرا نہ ہوجائے، گھر کے ایک معتبر بھید ہی سے روایت ہے کہ مولانا خاندان کی تمام

عورتوں کے ساتھ ایک ہی چارپائی پر بیٹھے ہوتے ہیں اور صبح سے شام تک ان کے قصے قضیے چکایا کرتے ہیں، ان ہی کی زبان میں اور کبھی کبھی ان ہی کے لہجہ اور روزمرہ میں گفتگو کرتے ہیں، اور ان ہی کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں، اسی دوران میں کبھی کبھی ان میں سے کئی کئی ایک ساتھ کپڑوں کی فرمایش کر دیتی ہیں تو مولانا جس طرح بیٹھے ہوتے ہیں ویسے ہی اُٹھ کر بازار چلے جاتے ہیں ایک دفعہ میں نے بھی مولانا کو بایں ہیئت کذائی دیکھا کہ دال منڈی (بنارس) میں ننگے سر بزاز کے ہاں سے کم سے کم دو درجن کپڑے کے تھان نوکر کے سر پر رکھوائے چلے آرہے ہیں، ایک ہاتھ میں رشتہ دار عورتوں ہی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی گلوری ہے پاؤں میں سلیم شاہی جوتی بہ شکل سلیپر، راستہ میں ایک بساطی سے اہلِ حدیث قسم کی بحث کر رہے تھے، بڑے تپاک سے ملے کہنے لگے صدیقی صدیقی خوب آئے، بغل گیر ہونے پر آمادہ ہوئے، تو میں نے کہا، مولانا شیروانی میرے پاس ایک ہی ہے اور نئی بھی ہے، اس پان کو یا تو یہیں کسی بالاخانے پر دے آیئے، یا اسی بساطی کو دیدیجئے، بڑی بحثیں کرتا ہے، آپ کا پان کھا کر گلپھڑوں کو روئے گا، مولانا پان میں صرف چونا کھاتے ہیں!

ہم دونوں مکان واپس آئے، عورتوں نے باوجود مولانا کی فصاحت و بلاغت کے سارے کپڑے واپس کر دئے اور فرمایش کر دی کہ اور لاؤ، مولانا پھر آمادۂ سفر ہوئے اور اس اطمینان کے ساتھ گویا دارالمصنفین میں دعوت کھانے جارہے ہیں نے کہا مولانا یہ نہ ہوگا، کپڑے نوکر سے واپس کر دیجئے، آپ جس ہیئت سے دال منڈی میں گشت لگاتے ہیں اس کا اثر وہاں کے "بالانشینوں" پر کیا پڑے گا، مولانا نے کہا دال منڈی والیوں کا خیال کروں یا گھر والیوں کا، دال منڈی میں تم جانے نہیں دیتے، گھر والیاں اندر نہ گھسنے دیں گی، میں نے کہا مولانا کچھ پروا نہیں، یہ دیکھئے سامنے کیسے اچھے سیخ کے کباب، پیاز کے لچھے نظر آرہے ہیں، ہم آپ یہی کھائیں گے، آپ شعر سنایئے گا میں سورہوں گا، اتنے میں آہ خدا نبی احمد مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے آگئے، کہنے لگے صدیقی تمہارا آنا ہم سب کی نجات کا باعث ہوا، ورنہ اقبال ان عورتوں کے پھیر میں تمام دن دال منڈی میں آسیب گم گشتہ کی طرح چکر لگانے، ادھر گھر میں عدالت دیوانی کا پورا اجلاس ہو رہا ہے عجیب ضیق میں جان تھی

مولانا سہیل کو فنِ عمارت میں بھی درک ہے، جس طرح مشکل زمین میں اچھے شعر نکالنا ہر شاعر کا کام نہیں ہے اسی طرح شہر کی چپقلش میں عمارت کا اچھا نقشہ بنانا بھی کچھ آسان نہیں ہے، عجیب عجیب ٹیڑھی میڑھی زمین میں مولانا نے ایسے خوش وضع مکان بنوائے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، معلوم نہیں مولانا اچھا کھانا کھانے کے شایق ہیں یا نہیں، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ مولانا کے گھر میں نہایت اچھا اور ستھرا کھانا پکتا ہے، میں نے اکثر اپنے خرچ سے مولانا کے یہاں ارہر کی دال اور کھڑے مسالے کا گوشت کھانے اور ان کے بالاخانے کے "ہوادار" برآمدے میں سونے کے لئے اعظم گڑھ جیسے مہمل مقام کا سفر کیا ہے، مولانا پان بیحد کھاتے ہیں اور دانت نہیں صاف کرتے، جس طرح بعض لوگ شکر کی چائے پیتے ہیں اسی طرح مولانا چونے کی خاطر پان کھاتے ہیں، فن عمارت کی اصطلاح یا استعارہ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ پان پر کتھے کی صرف کوچی پھری ہوتی ہے اور چونے کا پلاسٹر۔ لیمو کے بڑے دلدادہ ہیں، ایک دن کہنے لگے کہ اللہ میاں نے (اگر عیسائیوں کا عقیدہ صحیح ہے) چھ دن میں ساری دنیا بنائی اور ساتویں دن لیمو سے دل بہلایا۔ پھر لیمو اور عورت پر ساتھ ساتھ گفتگو شروع کر دی۔

مولانا اعظم گڑھ میں وکالت کرتے ہیں، خوب چلتی ہے جس کا تفصیلی تذکرہ میں نے ایک دوسرے مضمون میں کیا ہے، وکالت کے پیشے سے میں طبعاً متنفر ہوں اور میری دلی خواہش ہے کہ مولانا اس عذاب سے نجات پا جائیں۔ مولانا کا بہترین مشغلہ تصنیف و تالیف یا درس و تدریس ہوگا۔

(پروفیسر) رشید احمد صدیقی، علیگڈھ

جنگ کی ہولناک تاریخ

(ہندوستان و پاکستان دونوں کی خدمت میں)

۱۴۶۹ء قبل مسیح سے ۱۹۳۰ء تک تقریباً چار ہزار سال کے زمانہ میں صرف ۲۸۷ سال نسبتاً امن و سکون کے ساتھ گزرے ہیں ورنہ باقی ۳۱۱۲ سال کا زمانہ جنگ و جدل ہی میں گزر گیا اس دوران میں قیام امن کی جو کوششیں کی گئیں، ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۵۰۰ قبل مسیح سے ۱۸۶۰ء تک مختلف قوموں اور ملکوں کے درمیان آٹھ ہزار عہد نامے دائمی صلح و آشتی قایم رکھنے کے لئے کئے گئے لیکن ان میں کسی معاہدہ کی عمر دو سال سے زیادہ پایدار ثابت نہ ہوئی۔

یوروپ کی مشہور ۳۰ سالہ جنگ کے آغاز (۱۶۱۸ء) کے بعد ۱۷۰۰ اور بڑی بڑی جنگیں دُنیا میں ہوئیں، جن میں سے سب سے زیادہ حصّہ فرانس نے لیا، اس کے بعد آسٹریا ہنگری نے اور پھر برطانیہ و پروشیا نے۔

اس زمانہ میں فرانس، برطانیہ سے ۷۳ سال برسرِ پیکار رہا، پروشیا اور جرمنی سے ۸۰ سال اور اسپین سے ۶۲ سال لیکن موجودہ تاریخ کی سب سے زیادہ طویل جنگ فرانس و برطانیہ کی جنگ تھی جو ۱۳۳۷ء میں شروع ہوئی اور سو سال تک جاری رہی۔

۵۰۰ قبل مسیح سے ۱۹۲۵ء تک یونان، روم، وسطی یوروپ، جرمنی، اٹلی، فرانس، برطانیہ، نیدرلینڈ، اسپین اور روس کے درمیان ۹۰۲ لڑائیاں ہوئیں۔

بارھویں اور تیرھویں صدی میں روس سب سے زیادہ مبتلائے جنگ رہا، چودھویں صدی میں انگلستان پندرھویں سولھویں، سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں آسٹریا (رومہ کی مقدس حکومت) اور انیسویں صدی میں فرانس کو لڑائی سے زیادہ سابقہ پڑا۔

اس امر کا اندازہ کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ لڑائی کی خونخواریاں برابر بڑھتی رہی ہیں اس سے ہو سکتا ہے کہ ۳۷۵ء سے ۱۶۴۸ء تک نبرد آزما سپاہ کی تعداد ۱۵ ہزار سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ اٹھارھویں صدی میں یہ تعداد ۴۰ ہزار تک پہونچ گئی، نپولین کے عہد میں ۸۰ ہزار تک اور روس و جاپان کی جنگ میں ایک لاکھ تک۔ اس کے بعد لیپزگ کی جنگ (۱۸۱۳ء) میں یہ تعداد ۵ لاکھ تک پہونچ گئی اور پہلی جنگ عظیم میں صرف اٹلی کے ۱۴ میل کے محاظ پر ۴۰۸۴ توپیں نصب کی گئیں اور ۱۶ دن میں ۳۰ لاکھ فیر کئے گئے جن پر تین کروڑ پونڈ صرف ہوا۔

لڑائی میں آگ اور دھویں کا استعمال سب سے پہلے گیارھویں صدی میں چین نے کیا تھا، اس کے بعد تیرھویں صدی میں مغلوں نے یوروپ پر حملہ کے دوران میں اس سے کام لیا۔ اسی کے ساتھ منجنیقوں سے غلیظ کے برتن بھی دشمن کی فوجوں میں پھینکے جاتے تھے تاکہ وہ بدبو سے گھبرا کر لوٹ جائیں۔

موجودہ عہد کے میکانکی و کیمیائی آلات حرب کا استعمال پہلی جنگ عظیم میں کیا گیا۔ یہ جدید آلات ۳۰۰ کی تعداد

میں طیار کئے گئے، لیکن ان میں سے بارہ زیادہ کامیاب ثابت ہوئے۔ انھیں میں سے ایک گیس بھی تھی جس کا استعمال واشنگٹن کانگریس نے ۱۹۲۱ء میں ممنوع قرار دیدیا تھا، لیکن اس کی پابندی کسی نے نہیں کی اور ۳۵ء میں اٹلی نے حبشہ کے خلاف اور ۳۸ء میں جاپان نے چین کے خلاف اس کا استعمال بڑی آزادی سے کیا۔

بارود کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے چین نے اسے چھٹی صدی میں ایجاد کیا، لیکن اس کا استعمال صرف آتش بازی تک محدود تھا۔ سب سے پہلے ۱۲۳۰ء میں مغل سردار قبلائی خاں نے لڑائی میں اس کا استعمال کیا تیرھویں صدی میں یہ چیز یوروپ کو بھی معلوم ہوگئی چنانچہ جس چیز کو Break Fire کہا جاتا ہے وہ بارود ہی تھی۔

یوروپ میں سب سے پہلے اس کا استعمال ۱۲۴۷ء میں محاصرۂ اشبیلیہ کے وقت کیا گیا۔ بارود کے ساتھ جب توپ بھی بن گئی تو آمنے سامنے کی لڑائی کا طریقہ ختم ہوگیا، توپیں سب سے پہلے ۱۳۳۸ء میں بحری جنگ کے سلسلہ میں استعمال کی گئیں۔ اس کے بعد ۱۵۱۲ء میں جب انگریزوں اور فرانسیسیوں میں لڑائی ہوئی تو دونوں فریق کے جہاز توپوں سے آراستہ تھے۔ اس کے بعد جب ۱۴۵۱ء سے ۱۴۸۱ء تک سلطان محمد ثانی نے ادرنہ کا محاصرہ کیا تو اس نے توپوں سے کام لیا اور تین تین سو پونڈ کے سنگی گولے سر کئے گئے جن کی آواز تیرہ میل تک پہونچتی تھی۔

پیچھے کی طرف سے بھری جانے والی توپ سب سے پہلے کروپ نے ۱۸۵۷ء میں ایجاد کی اور ۱۹۰۱ء تک اس کو اتنا زوردار بنا دیا کہ اس کا گولہ چھ میل تک جاتا تھا۔

پہلی جنگ عظیم میں جرمنی نے جو توپیں استعمال کیں ان کا گولہ میدان میں ۸۰ میل تک اور بلندی میں ۲۸ میل تک پہونچ جاتا تھا۔ اس جنگ کے لئے فرانس کے کارخانوں نے ۱۷۵۰۰ ہلکے اور ۴۰ ہزار بھاری گولے روزانہ طیار کئے۔ دستی بم ۳۰ کرور کے قریب استعمال کئے گئے اور اس طرح گویا ۱۳ لاکھ ٹن فولاد ایک مہینہ میں آگ اور دھوئیں کی نذر ہوگیا۔

فوجی جوتوں کا استعمال سب سے پہلے مصر میں ۳۰۰۰ سال قبل مسیح شروع ہوا۔ یہ جوتے پیپرس (ایک قسم کی گھاس) سے بنائے جاتے تھے۔ گھوڑوں کی نعل کا رواج بھی ۳۰۰ء سے پہلے نہیں تھا۔ اس سے قبل سموں پر ایک خول سا چڑھا دیا جاتا تھا۔ ان ملکوں میں جہاں کی زمین نرم تھی یا سبزہ سے ڈھکی رہتی تھی وہاں تو نعلوں کی ضرورت نہ تھی، لیکن جاپان میں گھاس پھونس کی نعل کا رواج پایا جاتا تھا۔ روما کی سڑکیں چونکہ پتھریلی تھیں اس لئے وہاں اسکی ضرورت زیادہ محسوس کی گئی اور انھوں نے چمڑے کی نعلیں طیار کیں۔

رکاب کا رواج بھی قدیم روما و یونان میں نہ تھا۔ اس کو سب سے پہلے یوروپ میں سرمتی قوم نے رائج کیا۔ اس قوم کی اولاد اب روس میں آباد ہے۔ زین البتہ قدیم زمانہ میں بھی پایا جاتا تھا اور اس کی مختلف شکلیں تھیں، چنانچہ قدیم اسیریا کی سوار فوج زین استعمال کرتی تھی اور اہلِ روما اپنے گھوڑوں کی پیٹھ پر کپڑا، چمڑا یا سمور ڈال دیتے تھے

فوجی جھنڈا بھی بڑی پرانی چیز ہے، چنانچہ قدیم مصری فوجیں جب حملہ کرتی تھیں تو جھنڈا ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔ اس پر اپس دیوتا کے بیل اور گھڑیال کی تصویر منقوش ہوتی تھی۔ اسیریا کے جھنڈے پر فاختہ بنی ہوتی تھی اور فارس کے نیزوں پر سنہرے عقاب کی جھنڈیاں لگی رہتی تھیں۔ اسپارٹا کے جھنڈے پر ہرا کلس کی تصویر ہوتی تھی اور ایتھنس کے جھنڈے پر سرخ رنگ کے اُلو کی۔ روما کے جھنڈوں پر عقاب، بھیڑئے، سور اور گھوڑے کی تصویریں ہوتی تھیں۔

مصر قدیم میں ۳۰۰۰ سال قبل مسیح ہر ضلع کے اندر ایک فوجی دستہ رہا کرتا تھا اور لڑائی کے زمانہ میں اضلاع کے دستے اکٹھا ہوکر پوری فوج بنا لیتے تھے۔ یہ فوج صرف نیزہ بازوں اور تیر و کمان چلانے والوں کی ہوتی تھی۔ خود، زرہ، تلوار کا وجود اس وقت نہ تھا۔ ۱۵۰۰ سال بعد وہاں دو مستقل فوجیں رکھی گئیں جن کے سردار مصری ہوتے تھے اور سپاہ

میں دوسری قوموں کے لوگ بھی۔ اب وہ تبر اور تلواروں سے بھی آراستہ تھے اور جنگی رتھ بھی رکھتے تھے۔ افسر اپنے ہاتھوں میں چھوٹے ڈنڈوں کی جگہ (جیسا آج کل رواج ہے) دستی پنکھے لئے رہتے تھے۔

قدیم بابل، اسیریا اور میدیا میں، پیادہ و سوار دونوں فوجیں پائی جاتی تھیں اور جنگی رتھ بھی تھے۔ سب سے پہلے فارس میں عسکر شاہی قایم ہوا جسے بادشاہ کی ذات کا حلف فرمانبرداری لینا پڑتا تھا۔ اس باڈی گارڈ کا سالانہ ریویو بھی ہوتا تھا۔

اس وقت صرف پارتھا (جو بحر اخضر کے شرق و جنوب کی طرف واقع تھا) ایک ایسا ملک تھا جس کی سوار فوج بہترین قسم کی تھی اور زرہ بھی استعمال کرتی تھی۔ بعد کو یہ افواج روما میں ضم ہوگئیں۔

یونانی فوج سول قسم کی مسلح جماعت تھی جسے کوئی تنخواہ نہ ملتی تھی۔ ضرورت کے وقت ان میں غلاموں کو بھی شامل کرلیا جاتا تھا۔ سوار فوج قدیم یونان میں بالکل نہ تھی۔ مقدونیہ میں البتہ ایک مستقل فوج رہتی تھی لیکن ضرورت کے وقت اُجرت پر بھی سپاہی بھرتی کرلئے جاتے تھے۔

دوسری صدی قبل مسیح تک روما کا سپاہی بڑا جری سپاہی سمجھا جاتا تھا اور ۲۳ سال قبل مسیح تک روما کی سپاہ ۴ لاکھ ۵۰ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔

فوجی رتھوں کی ایجاد اسیریا والوں نے کی تھی جس نے رفتہ رفتہ موجودہ بکتر بند موٹروں کی شکل اختیار کرلی۔ سب سے پہلے بکتر بند گاڑی ۱۸۸۵ء میں طیار کی گئی، بعد کو ۱۹۰۴ء میں ڈیملر نے بکتر بند موٹر طیار کئے جن پر توپیں بھی نصب ہوتی تھیں۔ ۱۹۱۴ء میں سب سے پہلے ان موٹروں کا استعمال فرانس نے کیا۔ ۱۹۳۷ء کے آغاز میں روس کے پاس ۶ سے ۱۰ ہزار تک دبابے (ٹینک) پائے جاتے تھے، فرانس کے پاس ۴۰۰۰ اور برطانیہ و پولینڈ کے پاس ۶، ۶ سو

جنگ کی تباہکاریاں

تیس سالہ (۱۶۱۸ء ۔ ۱۶۴۸ء) جنگ میں جرمنی کے ایک کرور ۲۰ لاکھ آدمی کام آئے اور ورٹمبرگ کی آبادی ۹ لاکھ سے گھٹ کر ۵۰ ہزار رہگئی۔

انقلاب فرانس اور نپولین کی جنگوں میں ایک کرور فرانسیسی کام آئے اور ۱۸۱۲ء میں فرانس کی جو ۶ لاکھ فوج روس پر حملہ کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی اس میں سے صرف ۲۰ ہزار سپاہی واپس آئے اور ایک کرور ۲۵ لاکھ پونڈ صرف ہوئے امریکہ کی سول وار میں (۱۸۶۱ء ۔ ۱۸۶۵ء) ۳۰ کرور ۵۰ لاکھ پونڈ صرف ہوئے اور ایک لاکھ ۵۰ ہزار سپاہیوں میں ۲۰ ہزار کام آئے۔

۱۸۵۹ء کے جنگ میں جو فرانس و اٹلی کے درمیان ہوئی ۵۵ ہزار سپاہی مارے گئے۔ آسٹریا پروشیا کی لڑائی (۱۸۶۶ء) میں ۴ لاکھ آدمی کام آئے۔ ۱۸۵۹ء کی روس و ترکی کی جنگ میں ۱۲ لاکھ ۵۰ ہزار سپاہی مارے گئے۔ فرانس اور پروشیا کی جنگ ۱۸۷۰ء میں ۲ لاکھ ۹۰ ہزار سپاہی کام آئے اور علاوہ تاوانِ جنگ کے ۵۰ کرور ۶۰ لاکھ پونڈ فرانس کو خرچ کرنا پڑا۔ اسپین اور امریکہ کی جنگ (۱۸۹۸ء) میں ۵ کرور پونڈ امریکہ کے صرف ہوئے اور ۳۵ ہزار پونڈ روزانہ اسپین کو صرف کرنا پڑا۔

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء ۔ ۱۹۱۸ء) میں ۸۰ ارب پونڈ صرف ہوئے۔ ایک کرور سے زیادہ آدمی مارے گئے۔ ۲ کرور زخمی ہوئے اور ایک کرور آدمی انفلوئنزا میں مرے جو اس لڑائی کے بعد پھیلا اس جنگ سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد سات کرور تھی۔

صنعتی پیداوار کو جو نقصان پہونچا اس کا اندازہ ۴۲ ارب ۵۰ کرور پونڈ کیا جاتا ہے، جرمنی میں بزمانۂ جنگ شرح ولادت

۳۰ لاکھ کم ہوگئی۔ اس جنگ کے ختم ہونے کے بعد جو ذخائر فروخت کئے گئے ان کی قیمت ۶۶ کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ تھی۔

۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں اٹلی نے حبشہ پر حملہ کرنے کے لئے ۳ لاکھ ۵۰ ہزار سپاہ روانہ کی، اس کے علاوہ ۵ کروڑ ۳۰ لاکھ فٹ خیمہ کا کپڑا، ۶ کروڑ ۲۰ لاکھ فٹ دوسری قسم کا کپڑا، ۷ ہزار گھوڑے، ۳۵۰۰ موٹریں، ۱۱۵۰۰ مشین گن، ۲۵۰۰۰ رائفل، ۸۰۰۰ توپیں، ۳۰۰۰ ٹینک، ۵۵۰۰ ٹیلی فون، دو ہزار میل تار، اور ۱۰۸۱ وائرلیس سیٹ فراہم کرنا پڑے۔ اسی لڑائی میں ۴۳۷ ہوائی جہازوں سے ایک ہزار ٹن وزن کے بم گرائے گئے، ۱۵۵۰۰۰ کارتوس استعمال ہوئے اور ۴۶ ٹن غذا ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے محاذ جنگ میں پہونچائی گئی۔

یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو برطانوی فوج کی تعداد ہندوستانی افواج کو ملاکر ۸ لاکھ ۳۱ ہزار تھی (جن میں ۱۵۵۰۰۰ ہندوستانی سپاہی تھے)۔ ۳۸ء کے ابتدا میں جنگی ہوائی جہاز ۱۵۰۰ اور ۱۷۵۰ کے درمیان تھے اور ہوائی فوج ۶۲۹۰۰۔ بحری فوج کی تعداد ایک لاکھ ۲۰ ہزار تھی، جہازوں کی ۲۸۰، اور آبدوز کشتیوں کی ۵۲۔

۳۳ء میں فوجی بجٹ ۹ کروڑ ۳۵ لاکھ پونڈ تھا لیکن ۳۷ء میں ۱۷ کروڑ ۲۳ لاکھ ۳۳ ہزار پونڈ تک پہونچ گیا۔

۳۷ء میں فرانس کی بری فوج ۶۹۲۸۶۰ تھی، ہوائی فوج ۶۳ ہزار۔ ہوائی فوج کا بجٹ ۶ کروڑ پونڈ سے ۲۰ کروڑ پونڈ تک پہونچ گیا اور ۳۹ء میں ہر مہینے ۵۰۰ جہاز اس نے طیار کئے۔ بحری فوج ۳۶ء میں فرانس کے پاس ۱۵۷۰۰ تھی اور دو سال بعد بحری جہازوں کی تعداد ۱۴۷ تک پہونچ گئی۔

۱۹۱۳ء میں جرمنی کی بری فوج ۸ لاکھ تھی اور ۱۰ لاکھ ٹن وزن کے بحری جہاز جن پر وہ سات کروڑ پونڈ سالانہ صرف کرتا تھا۔ ۲۸ء میں شکست کھانے کے بعد اس کی فوج صرف ایک لاکھ رہ گئی۔

سوویٹ حکومت کی آبادی ۱۸ لاکھ ہے اس لئے وہ زیادہ فوج رکھتا تھا۔ ۳۶ء میں اسکی سپاہ کی تعداد ۱۳ لاکھ تھی، لیکن اب اس میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ ۳۱ء میں اسکے پاس ۵۰۰۷ ہوائی جہاز تھے لیکن ۵ سال بعد اس میں چار چند اضافہ ہوگیا۔

۳۷ء میں امریکہ کی بحری و ہوائی فوج ۱۸۷۴۲۰ تھی، اور بری فوج نیشنل گارڈ اور رزرو وغیرہ ملاکر ۵ لاکھ۔ بحری قوت اس کی البتہ بہت زبردست تھی۔ ۳۷ء میں فوجی بجٹ ۲۰ کروڑ پونڈ تھا جو بعد کو بہت بڑھ گیا، جاپان نے جب چین پر حملہ کیا تو ۳۸ء میں خود اسکے ۱۰ لاکھ سپاہی محاذ جنگ پر موجود تھے۔ چینی افواج کی تعداد ۲۵ لاکھ تھی۔

اٹلی کی بری فوج ۵ لاکھ تھی لیکن بعد کو اس میں کافی اضافہ ہوگیا۔

مصارف اسلحہ سازی

۱۹۳۲ء میں مصارف اسلحہ سازی ۱۵ ملکوں میں بڑھ گئے، ۶ ملکوں میں اپنے حال پر قایم رہے اور ۳۷ ملکوں میں گھٹ گئے۔ ۳۵ء میں یہ مصارف ۵۱ ملکوں میں بڑھ گئے۔

۳۲ء میں دنیا کے مصارف اسلحہ سازی ۴ ارب ۳۰ کروڑ طلائی ڈالر سے بڑھ کر ۳۷ء تک تقریباً سات ارب طلائی ڈالر تک پہونچ گئے — روس نے طیاری اسلحہ میں بہت صرف کیا۔ یعنی ایک ارب ۱۴ کروڑ ۲۳ لاکھ روبل سے قریب قریب ۲۱ ارب تک پہونچ گیا، اسی طرح جرمنی، اٹلی، جاپان کے مصارف بھی بہت بڑھ گئے اور امریکہ جس نے ۳۲ء میں ۲۴ کروڑ ۱۶ لاکھ ڈالر طیاری اسلحہ پر صرف کئے تھے، ۳۷ء میں ایک ارب ڈالر صرف کئے — الغرض جب سے دنیا آباد ہوئی ہے انسان برابر آپس میں لڑتے ہی رہیں اور زمانہ کے ساتھ ساتھ جنگ کی خونخواریاں بڑھتی ہی رہیں اور یہی کوشش جاری رہی کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کا خون بہایا جاسکے، چنانچہ آیندہ جنگ کی جو طیاریاں ہو رہی ہیں وہ ایٹم بم اور ہائڈروجن بم کی طیاری کی وجہ سے ایک ایسے قیامت خیز زمانہ کی خبر دے رہی ہیں، جو روئے زمین سے انسانی وجود ہی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے والا ہے اور اگر دنیا کے موجودہ اختلافات ختم نہ ہوئے جس کا یقین ہے، تو اس میں شک نہیں کہ وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے۔

"گاہے گاہے باز خواں ——"

مذہب و خدا کا تصوّر

(عقل و فکر کے نقطۂ نظر سے)

علم و مذہب کی جنگ کوئی نئی چیز نہیں اور نہ ہم اسے فطرت کے خلاف کہہ سکتے ہیں، کیونکہ مذہب کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اسے بغیر چون و چرا تسلیم کر لینا چاہئے اور اہلِ علم کی حجت یہ ہے کہ جب تک کوئی بات سمجھ میں نہ آجائے اس پر یقین لانا ممکن نہیں - اہلِ مذاہب اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ عقل انسانی بہت ناقص ہے اور اس سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی کامل شے کا تصور کر سکے - فریقِ ثانی کہتا ہے کہ جس چیز کو تم "شئے کامل" سے تعبیر کرتے ہو اس کا ثبوت تمھارے پاس کیا ہے کہ ہماری عقل ناقص کو اس کے سمجھنے سے باز رکھتے ہو - الغرض اہلِ علم و مذاہب کی یہ نزاع بہت قدیم چیز ہے اور باختلافِ نوعیت اب بھی اسی طرح بلکہ زیادہ شدت کے ساتھ نظر آتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے حکومت و مذہب دونوں ایک چیز تھے اور اہلِ مذاہب بزورِ شمشیر اپنے مخالفین کو خاموش کر سکتے تھے، اب ایسا نہیں کر سکتے اور معاندین مذہب کی جماعت بڑھتی جا رہی ہے -

یورپ اور خصوصیت کے ساتھ امریکہ میں جہاں خدائے قادرِ مطلق کے بجائے Almighty dollar کی پرستش کی جاتی ہے الحاد نہایت تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور اہلِ کلیسہ حیران ہیں کہ "آسمانی بادشاہت" کے وجود کو کیونکر قایم رکھ سکیں -

ہندوستان میں بھی یہ رو کافی تیزی کے ساتھ دوڑ رہی ہے اور یہاں کے حلقہ ہائے مسجد و خانقاہ میں بھی ان کفر سامانیوں کو نہایت تشویش کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے لیکن اس وقت تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس طوفان سے بچنے کی صورت کیا ہے -

اہلِ مذاہب کی طرف سے جو تدبیر دفاع اختیار کی جاتی ہے وہ زیادہ تر اس لئے بے اثر رہتی ہے کہ انھیں معلوم ہی نہیں کہ ملاحدہ کہتے کیا ہیں اور وہ کن دلایل کی بنا پر خدا اور مذہب سے انکار کرتے ہیں، امریکہ وغیرہ میں تو اہلِ مذہب اُن کے لٹریچر کو شاید کبھی پڑھ لیتے ہیں لیکن ہندوستان میں تو اس کا دیکھنا ہی گناہ سمجھا جاتا ہے اور اس لئے یہاں کے اہلِ مذہب قطعاً ناواقف ہیں کہ اس زمانہ کا الحاد کس قسم کا الحاد ہے اور اس کے لئے کن نئی طیاریوں کی ضرورت ہے -

مسلمانوں میں اس وقت صرف دو چار رسایل ایسے ہیں جنھوں نے اپنا مقصود الحاد کی مخالفت اور اسلام کی حمایت قرار دے رکھا ہے لیکن حقیقتاً ان میں کوئی ایک رسالہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس بیسویں صدی کے منکرین خدا کو خاموش کر سکے اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ جو راہ انھوں نے خدمت اسلام کی اختیار کی ہے وہ نہ صرف یہ کہ بالکل غلط ہے بلکہ اور زیادہ دہریت پھیلانے والی ہے کیونکہ اگر ہم کسی کی بات نہ سنیں اور اپنی ہی کہے جائیں تو ظاہر ہے کہ ہم کو بُرا ہی سمجھا جائے گا، پھر چونکہ پیروانِ اسلام اپنے مذہب کو سب سے زیادہ مکمل اور عین فطرت کے مطابق کہتے ہیں اسلئے

ان کی طرف سے جب اس نوع کی جاہلانہ کوششیں دیکھتا ہوں تو مجھے سخت حیرت ہوتی ہے۔

علماء اہل اسلام کی طرف سے ایک عام طریقہ جواب کا یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ مذہب کے خلاف جو اعتراض کئے جارہے ہیں وہ نئے نہیں ہیں بلکہ بہت پرانے ہیں اور ان کا جواب دیا جاچکا ہے۔ اول تو مجھے اسی میں کلام ہے کہ ان پرانے اعتراضات کو بھی کبھی دفع کیا گیا ہے یا نہیں اور اگر اسے مان بھی لیں تو انھوں نے یہ کیونکر جان لیا کہ موجودہ ذہنی انقلاب وہی ہے جو اس سے پہلے پایا جاتا تھا اور اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔

اگر اہلِ مذاہب واقعی الحاد کا سدباب کرنا چاہتے ہیں تو ان کا فرض یہ ہے کہ پہلے ملحدین کے بیانات کو سنیں، بغیر کسی جذبۂ غیظ و انتقام کے ٹھنڈے دل سے سنیں اور پھر غور کریں کہ ان کے دلایل کا کوئی مسکت جواب اُن سے ممکن ہے یا نہیں۔ صرف گالیاں یا بددُعائیں دینے سے کام نہیں چلتا۔

مذہب کیا ہے؟ "خدا ہی نے تمام چیزیں پیدا کی ہیں اور وہی ان کا مدبّر ہے، اس لئے مخلوق کا فرض ہے کہ وہ اپنے خالق کا مطیع رہے، یعنی اگر اس کی طرف سے کوئی حکم نافذ کیا جائے تو اس کی تعمیل کرنا ہر شخص پر لازم ہے۔"

یہ ہے اصل مفہوم مذہب کا جو صدیوں سے رائج چلا آتا ہے اور تمام قوموں نے اسی اعتقاد کے تحت یقین کرلیا کہ خدا ہم سے قربانیاں چاہتا ہے چنانچہ اول اول لوگوں نے اپنی اولاد تک کو بھینٹ چڑھانے سے عذر نہ کیا اور پھر صرف بیل، بھیڑ، بکری کے خون سے خدا کو راضی رکھنے کی کوشش کی گئی کیونکہ وہ اگر ایسا نہ کرتے تو خدا ان کی فصلیں خراب کردیتا، پانی برسانا بند کردیتا، بیماریاں پھیلاتا، زلزلے لاتا اور قحط و وبا کی مصیبت میں مبتلا کردیتا۔ اس اعتقاد قربانی کی آخری جھلک عیسوی مذہب میں بھی پائی جاتی ہے اور اسلام میں بھی۔ وہاں خدا اپنے بیٹے کی قربانی قبول کرکے ہمیشہ کے لئے چین سے بیٹھ گیا اور یہاں ابراہیم خلیل اللہ کے تہیۂ قربانی سے خوش ہوکر آیندہ کے لئے۔ صرف جانوروں کی قربانی پر راضی ہوگیا۔

اہلِ مذاہب کا یہ اعتقاد بھی بہت قدیم ہے کہ خدا ہماری التجائیں سنتا اور ان کو پورا کرتا ہے، اس لئے ان اعتقادات کے پیش نظر قدرتاً چند سوال پیدا ہوتے ہیں جو اصل بنیاد ہیں لامذہبیت کی اور چونکہ اسوقت تک اہلِ مذاہب کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکے ہیں اس لئے ملحدین خود ہی اس سے ایک نتیجہ اخذ کرلیتے ہیں اور اس پر مطمئن ہوجاتے ہیں۔

شبہات ملاحظہ ہوں:-

۱- کیا مذہب کی بنیاد کسی حقیقت معلومہ پر قایم ہے؟

۲- کیا واقعی کوئی ایسی ہستی پائی جاتی ہے جسے خدا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے؟

۳- کیا واقعی خدا ہمارا خالق ہے؟

۴- کیا واقعی اس نے کبھی ہماری دُعاؤں کو سُنا ہے؟

۵- کیا واقعی قربانیوں سے خوش ہوکر اس نے کسی قوم کے ساتھ کوئی خاص رعایت روا رکھی ہے؟

۶- اگر واقعی اسی نے انسان پیدا کیا ہے تو کیوں ایسے افراد اس نے پیدا کئے جو مسخ و قبیح ہیں، مفلوج و محتاج ہیں اور ذہنی حیثیت سے حد درجہ پست۔

۷- مجرموں، دیوانوں اور بے عقل لوگوں کو پیدا کرنے میں اس کی کیا مصلحت تھی۔ کیا کسی ایسی قوت کی طرف

ہے جسے خراست کل اور قوت مطلق کہتے ہیں، ان نقائص تخلیق کی کوئی معقول توجیہ پیش کی جا سکتی ہے۔

۸۔ اگر خدا تمام امور عالم کا مدبر و منظم ہے تو کیا وہ ان بادشاہوں کے افعال کا ذمہ دار نہیں ہے جنھوں نے دنیا میں سوائے ظلم کے اور کچھ نہیں کیا؟ کیا وہ ان تمام لڑائیوں کا ذمہ دار نہیں ہے جن میں لاکھوں بیگناہوں کا خون بہایا جاتا ہے۔

۹۔ کیا وہ دور غلامی اس کی مرضی کے موافق نہ تھا جب صدیوں تک ہزاروں بیگناہ انسانوں کی پیٹھ کوڑوں سے لہولہان بنی رہی اور بے شمار ماؤں کے مضطرب سینوں سے اُن کے بلکتے ہوئے بچے جدا جدا کر کے قتل و ذبح کر دئے گئے۔

۱۰۔ کیا وہ اُن مذہبی تعذیبات کا ذمہ دار نہیں جو بے گناہ انسانوں کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونک دینے اور شکنجے میں تان تان کر ایک ایک جوڑ علٰحدہ کر دینے پر مشتمل تھے۔

۱۱۔ خدا نے کیوں ظالموں اور بدکرداروں کو مہلت دی کہ وہ بہادروں اور نیک کرداروں کو پامال کریں۔

۱۲۔ خدا نے کیوں کافروں کو اس کا موقع دیا کہ اس کے خاص بندوں کو عذاب میں مبتلا کریں۔ اگر ایک رحم و کرم والا خدا واقعی کائنات کا مدبر ہے تو یہ آئے دن کے طوفانوں، زلزلوں، وباؤں اور خشک سالیوں کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے؟ سِل و دق، سرطان و خناق اور اسی طرح کی سیکڑوں بیماریاں پیدا کرنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے جن سے نہ معصوم بچے جانبر ہو سکتے ہیں نہ زاہد و جانبر انسان ـــــ درندوں کا انسانوں کو پھاڑ کر کھاتے رہنا، اور خدا کا کچھ نہ کہنا عجیب معمہ ہے۔

۱۳۔ کیا اس نے ناخن و چنگال اسی لئے پیدا کئے کہ وہ گوشت کے ریشے جدا کرتے رہیں، کیا اس نے پر و بال اسی لئے بنائے ہیں کہ معذور و بیکس آسانی سے گرفت میں آ سکیں، کیا اس نے جراثیم اسی لئے پیدا کئے ہیں کہ وہ انسانوں کو اندھا، کوڑھی، مسلول و مدقوق بنا کر اپنی بھوک مٹائیں۔

۱۴۔ کیا کائنات کی تنظیم اسی طرح ممکن تھی کہ جاندار کی زندگی دوسرے جاندار کے گوشت و خون پر منحصر ہو اور کیا تدبیر عالم آہ اور کراہ کا ہنگامہ پیدا کئے بغیر محال تھی؟

پھر ان واقعات و حالات پر غور کرو اور سمجھو کہ مذہب کیا ہے؟

وہ نام ہے صرف ایک بے بنیاد خوف کا۔ ایک ایسا خوف جو خود ہی ایک قربانگاہ بناتا ہے اور خود ہی اس پر قربانیاں چڑھاتا ہے۔ خود ہی ایک معبد طیار کرتا ہے اور خود ہی وہاں جھک جاتا ہے۔

مذہب ہمیں وہی باتیں سکھاتا ہے جو صرف ایک غلام ہی کے لئے موزوں ہیں۔ اطاعت فرمانبرداری، نفس کشی صبر و تحمل، عدم مقاومت اور اپنے آپ کو مٹا دینا۔

خود مختاری، سرفرازی، خود اعتمادی، جرأت و اقدام کا وہاں کوسوں پتہ نہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ خدا مالک ہے اور انسان اس کا غلام، لیکن مالک چاہے کتنا ہی بڑا ہو غلامی کو خوشگوار نہیں بنا سکتا

اگر خدا کا وجود ہے تو ہم کیونکر جان سکتے ہیں کہ وہ رحم و کرم والا بھی ہے وہ دیکھتا ہے کہ لاکھوں کروروں غریب و جفاکش انسان ہل چلا رہے ہیں، کھیتیاں بو رہے ہیں اور ان کی زندگی کا انحصار صرف اسی محنت پر ہے لیکن وہ پانی نہیں برساتا، کھیتیاں مرجھا رہی ہیں لیکن پانی کا ایک قطرہ نہیں گراتا، کروروں انسان اپنی مایوس و منتظر آنکھوں سے

آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں لیکن سوا جھلسا دینے والے آفتاب کے بادل کا ایک ٹکڑا بھی انھیں کسی جگہ نظر نہیں آتا۔ خدا ان کے دل کے اضطراب کو دیکھتا ہے اور رحم نہیں کھاتا ان کی اشک آلود آنکھوں کو دیکھتا ہے اور خاموش ہے بچے ماؤں کی خشک چھاتیوں سے لگے ہوئے بلک رہے ہیں اور دودھ نہیں پاتے، مائیں آنچل پھیلا پھیلا کر اپنے بھوکے بچوں کا واسطہ دے دے کر دعائیں مانگ رہی ہیں، لیکن کوئی سننے والا نہیں، پھر کیا خدا کا رحم و کرم ثابت کرنے کے لئے باد سموم کے ان جھونکوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جو بستیوں کی بستیاں تباہ کر جاتے ہیں اور میدانوں کو لاشوں سے بھر دیتے ہیں، کیا اس کی شفقت و محبت کے ثبوت میں زلزلوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جب زمین ہزاروں انسانوں کو نگل جاتی ہے کیا آتش فشاں پہاڑوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جن کے شعلے بچے بوڑھے کی بھی تمیز نہیں کرتے۔

کیا اگر یہ تباہکاریاں نہ پائی جائیں تو ہم کو یہ شک کرنے کا موقع ملے گا کہ خدا اپنے بندوں کی طرف سے غافل ہے کیا اگر زلزلہ و طوفان، قحط و وبا کی مصیبتیں نازل نہ ہوں تو ہم کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ خدا مہربان نہیں ہے۔

الٰہیات والے کہتے ہیں کہ خدا نے تمام انسانوں کو یکساں پیدا نہیں کیا، اس نے قد و قامت، رنگ و صورت، ذہن و فراست کے لحاظ سے قوموں کو ایک دوسرے سے ممتاز کر دیا ہے، تو کیا بلند قوموں کو خدا کا شکر نہ ادا کرنا چاہئے کہ اس نے انھیں پست نہیں بنایا۔ یقیناً شکر کی بات ہے، لیکن اس صورت میں کیا پست قومیں اس بات کا شکریہ ادا کریں گی کہ خدا نے انھیں جانور نہیں بنایا؟

جب خدا نے بلند و پست قوموں کو بنایا تھا تو کیا یہ بات اس کے علم میں نہ تھی کہ بلند قومیں پست قوموں کو اپنا غلام بنائیں گی، ان کو ایذا پہونچائیں گی اور تباہ و برباد کر دیں گی۔

کیا وہ نہ جانتا تھا کہ یہ بلند و پست کا امتیاز دنیا میں کتنا خون بہائے گا نوع انسانی کو کن کن مصائب میں مبتلا کرے گا، کتنے میدان لاشوں سے پاٹ دے گا، کتنے غلاموں کے جسم کا گوشت کوڑوں کی ضرب سے پارہ پارہ کرے گا کتنے ماؤں کے دل ان کے بچے جدا کر کر کے تڑپائے گا پھر اگر یہ سب کچھ اس کے علم میں ہوا تو کیا اس کا رحم و کرم اس سے زیادہ دلدوز مناظر کا منتظر تھا۔

وہ قید خانے جن کی سنگین دیواروں سے سر ٹکرا کر دنیا کے بہت سے بلند اخلاق والے انسانوں نے اپنی جانیں دیدیں وہ سولیاں جو مقدس انسانوں کے خون سے رنگین بنائے جانے کے لئے نصب کی گئیں، وہ غلاموں کی جماعتیں جن کی پیٹھ کے زخموں کو خشک ہونے کا کبھی موقعہ نہیں دیا گیا، وہ مقدس ہستیاں جن کا ایک ایک جوڑ شکنجہ میں تان تان کر علٰحدہ کیا گیا، جن کی کھالیں کھنچوا کھنچوا کر بھس بھروایا گیا، وہ بے شمار انسان جو قحط و وبا کا شکار ہوئے، جن کو زمین نے نگل کر ڈکار تک نہ لی، جن کو سانپوں نے ڈسا، آتش فشاں پہاڑوں نے جھلسایا اور وہ لاتعداد بدکار ظالم انسان جنھوں نے دنیا میں تمام مظالم توڑے اور کامیاب زندگیاں بسر کیں۔ کیا یہ اور اسی طرح کے تمام سمجھ میں نہ آنے والے واقعات رحم و کرم والے خدا کے علم سے باہر تھے اور یہ سب کچھ بغیر اس کی مرضی کے ہوا؟

انسان نے ہمیشہ کسی نہ کسی مافوق الفطرت ہستی کا دامن پکڑنا پسند کیا۔ اگر اس نے پتھر کو پوجنا چھوڑا تو ایک اور غیر معلوم قوت کے سامنے جھک گیا۔ جس کو وہ صحیح راہ دکھانے والا باور کرتا ہے؟

انسان فطرتاً اقدام پسند واقع ہوا ہے، وہ ہمیشہ آگے قدم بڑھاتا ہے اور تجربات اس کو بتاتے ہیں کہ اس نے جو قدم اٹھایا تھا وہ صحیح تھا یا غلط؟

ایک آدمی کسی جگہ کا ارادہ کر کے چل پڑتا ہے وہ ایک ایسی جگہ پہونچتا ہے جہاں دو راستے پھٹتے ہیں، وہ بایاں

راستہ اختیار کرلیتا ہے لیکن اسے کچھ دور چل کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ راستہ غلط تھا، وہ واپس آتا ہے اور داہنے ہاتھ کا راستہ اختیار کرکے منزل تک پہونچ جاتا ہے اس کے بعد وہ اس جگہ پہونچنے میں غلطی نہیں کرتا اور ہمیشہ سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قوت نے کیا رہنمائی اس کی کی۔

ایک بچہ شعلہ کی چمک دیکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور جل جاتا ہے، اس کے بعد پھر یہ جرأت وہ کبھی نہیں کرتا۔ تو کیا یہ سبق اس کو اس قوت نے دیا یا خود اس کے تجربے نے۔

حقیقت یہ ہے کہ دُنیا کے تجربات میں خود وہ قوت پنہاں ہے جو صحیح راستہ بتانے والی ہے، یہ قوت ادراک وارادہ سے بالکل معرّا ہے اور اس کا نام ہے تجربہ۔

بہت سے لوگ ضمیر اور احساس اخلاق کے وجود کو وجود خدا کی دلیل بتاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان فطرتاً تمدن پسند واقع ہوا ہے اور خانوادوں، قوموں اور قبیلوں کی صورت میں ہمیشہ زندگی بسر کرتا چلا آیا ہے، پھر قبیلہ کے جن افراد نے خاندانی دعائلی مسرتوں میں اضافہ کیا وہ اس کے اچھے اعضاء شمار کئے گئے اور جنھوں نے تکلیفیں پہونچائیں انھیں بُرا سمجھا گیا اور یہیں سے اخلاق کے اچھے بُرے ہونے کا معیار قایم ہوا۔

وحشی قوموں میں ہمیشہ فوری نتائج پر غور کیا جاتا ہے، لیکن ترقی یافتہ قوموں میں نتائج بعیدہ کو سامنے رکھا جاتا ہے اور اس طرح اخلاق کا معیار بلند تر اور فرض شناسی کا احساس قوی تر ہوتا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں کسی مافوق الفطرت قوت کا کوئی دخل نہیں ہے۔

مذہب کیا ہے؟ ایک شخص عیسوی مذہب کو سامنے رکھ کر پوچھتا ہے کہ عیسویت نے دنیا کو کیا فایدہ پہونچایا جب اس کا اقتدار قایم کیا تھا تو کیا اس نے انسان کو زیادہ بہتر انسان بنایا۔ اس کا اثر اطالیہ، اسپین، پرتگال، اور آئرلینڈ پر کیا ہوا۔ ہنگری اور آسٹریا کو کیا فایدہ اس سے حاصل ہوا۔ انگلستان، امریکہ، ہالینڈ و اسکاٹلینڈ نے کیا تمتع اس سے حاصل کیا۔

اگر ٹورکسمڈ، زردشتی مذہب کا پابند ہوتا تو کیا اور زیادہ خراب انسان ہوتا۔ کیا کالون اور زیادہ خونخوار بن جاتا اگر وہ یہودی ہوتا، کیا ڈچ اور زیادہ احمق ثابت ہوتے اگر وہ تثلیث مسیحیت کے قایل نہ ہوتے۔ کیا جان ناکس اور زیادہ بُرے اخلاق کا ہوجاتا اگر بجائے مسیح کے وہ کنفوشش کا ماننے والا ہوتا۔

مذہب کا ہر زمانہ اور ہر ملک میں بہت کافی تجربہ ہوچکا ہے اور اب اس کی ناکامی پر مزید حجت پیش کرنے کے لئے کسی اور جدید تجربہ کی ضرورت نہیں ہے۔

مذہب کبھی انسان کے دل میں جذبۂ رافت و الفت پیدا نہیں کرسکا اور اس کے ثبوت میں مذہبی تاریخ کے وہ اوراق پیش کئے جاسکتے ہیں جن کا ایک ایک حرف خون سے رنگین ہے۔

مذہب، علم و تحقیق کا ہمیشہ دشمن رہا ہے اور اس نے کبھی ذہنی آزادی کا ساتھ نہیں دیا۔

مذہب کبھی انسان کو محنتی، جفاکش اور ایماندار بنانے میں کامیاب نہیں ہوا، چنانچہ وحشی اقوام کی برائیوں کا سبب صرف ان کی مذہبی واہمہ پرستی ہے۔

وہ لوگ جو فطرت کی یکسانیت کے قایل ہیں ان کے لئے مذہب کا خیال کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ کیا انسان، فطرت اور صفات اور مادہ کو اپنی دعاؤں سے متاثر کرسکتا ہے، کیا ہم طوفانوں کو پوجا پاٹ کے

ذریعہ سے کم و بیش کر سکتے ہیں، کیا ہم قربانیاں پیش کر کے ہواؤں کا رُخ بدل سکتے ہیں، کیا ہم الحاح و زاری سے بیماری کا علاج کر سکتے ہیں۔ کیا عزت و سربلندی ہمیں بھیک مانگنے سے مل سکتی ہے؟

وہ چیز جسے ہم نفس کہتے ہیں کیا وہ قانون قدرت کا اسی طرح پابند نہیں جس طرح ہمارا جسم؟

مذہب کی بنیاد اس خیال پر قایم ہے کہ عالم فطرت کا کوئی ایک مالک ہے جو دعاؤں کو سنتا ہے، اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے اور جزا و سزا دیتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ واقعات کی دُنیا میں کوئی ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی جس سے ہمیں ان اعتقادات کی تصدیق ہو سکے۔

جب ہم کوئی نظریہ قایم کرتے ہیں تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی بنیادی حقیقت ضرور ہوا کرتی ہے، محض وہم و قیاس پر کوئی اصول مرتب نہیں ہو سکتا اس لئے اگر ہم لامذہبیت کا نظریہ پیش کرتے ہیں تو اس کے لئے چند بنیادی حقایق بھی اپنے پاس رکھتے ہیں۔

مثلاً ایک یہ کہ مادہ و قوت فنا نہیں ہو سکتے، دوسرے یہ کہ مادہ و قوت ایک دوسرے سے علٰحدہ نہیں ہو سکتے تیسرے یہ کہ جو چیز غیر فانی ہے وہ غیر مخلوق ہے، قدیم ہے۔

دُنیا میں ذہانت و ذکاوت کا وجود صرف قوت کی وجہ سے ہے اور قوت بغیر مادہ کے ممکن نہیں اس لئے معلوم ہوا کہ ذکاوت صرف قوت و مادہ کی ممنون ہے اور اس باب میں کسی ایسی مافوق الفطرت ہستی کے تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے جسے مدبر کائنات کہا جائے!

اگر مادہ و قوت ازلی و ابدی ہیں تو جو کچھ ممکنات میں تھا وہ واقع ہوا جو ممکنات میں ہے وہ ظاہر ہو رہا ہے اور آیندہ بھی رونما ہوتا رہے گا۔ کائنات میں اتفاق کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہوتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور پایا جاتا ہے جس چیز کو ہم حال کہتے ہیں وہ ماضی کی پیداوار ہے اور جس کا نام مستقبل ہے وہ نتیجہ ہوگا حال کا، انسان سے لیکر رینگنے والے کیڑے کی حرکت تک سب اسی قانون کے جکڑے ہوئے ہیں اور اس کے خلاف کسی بات کا ظاہر ہونا ناممکن ہے۔

ہزاروں سال سے دُنیا کی اصلاح کی کوشش جاری ہے اور اس غرض کے لئے دیوتا، دیویاں، بہشت و دوزخ الہامات و معجزات کلیسا و خانقاہ، قیدخانے اور شکنجے، سیکڑوں چیزیں پیدا کی گئیں، ایک بادشاہ کو تخت سے اُتار کر دوسرے کو بٹھایا، ایک ملکہ کی گردن مار کر دوسری کو تخت نشین کیا، آدمیوں کو زندہ جلایا، فوج کشیاں کی گئیں، دُعائیں مانگی گئیں، ڈرایا گیا، لالچ دی گئی، الغرض مذہب نے بھی کچھ کیا لیکن مقصد آج تک پورا نہ ہوا۔ کیونکہ مذہب غلامی ہے ذہن و دماغ کی اور جب تک انسان کا ذہن آزاد و بیدار نہ ہو نوع انسان کی فلاح مجموعی حیثیت سے ناممکن ہے۔

یہ ہیں وہ خیالات اس زمانہ کے ملحد و لامذہب کے جو اخباروں رسالوں اور لکچروں کے ذریعہ سے تمام دُنیا میں اشاعت پا رہے ہیں اور ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی مقبول ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر ہم دہریت و الحاد کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتے ہیں تو ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ ہم دنیا کے اس ذہنی تشویش و تذبذب کو دور کریں پھر اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ ہم منطق و فلسفہ کی پیچیدہ باتوں میں اُلجھا کر فریق مخالف کو خاموش کرنے کی کوشش کریں کیونکہ اس طرح اس کی زبان تو بند ہو سکتی ہے لیکن دل مطمئن نہیں ہو سکتا۔ بلکہ

ضرورت ہے اس مذہبی روح کی تلقین کی جو ظاہری شعائر و مراسم سے بے نیاز ہے اور جس میں سوائے بلند تعلیم اخلاق کے کوئی اور چیز ایسی نہیں پائی جاتی جو ہمیں الہام و معجزات، بہشت و دوزخ، حشر و نشر، قیامت و آخرت کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی وہ تنگ نظری تھی جس نے اہل مذاہب کو ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رکھا اور یہی وہ چیز ہے جو مذہب کے اقتدار کو مٹا کر رہے گی۔ دُنیا میں اب کوئی ایسا مذہب نہیں چل سکتا جو تمدنی ضروریات، بین الاقوامی تعلقات، اقتصادی مشکلات اخلاقی اصول عامہ کو پس پشت ڈال کر صرف "امید فردا" پر اپنی کارگاہ تبلیغ قایم کرے، وہ وقت گزر گیا جب مذہب کسی ایک قوم کے لئے مخصوص ہوا کرتا تھا، اب کہ کرۂ زمین کی ۲۴ ہزار میل کی وسعت کو انسان چند دن میں طے کر لیتا ہے، تخصیص نسل و جغرافیہ کا سوال بالکل لایعنی چیز ہے اور مذہب کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ کوئی ایسا لائحہ عمل پیش کرے جو تمام آبادی کو کسی ایک مشترک پلیٹ فارم پر جمع کر سکتا ہو اور یہ ممکن نہیں جب تک مذہب کے اعتقادی حصہ کو علیحدہ کر کے اسے ہیئت اجتماعی کے اصول پر صرف "سوشل ارگنائزیشن" کی حیثیت نہ دی جائے۔

سالنامہ ۱۹۵۴ء

فرمانروایانِ اسلام نمبر

کی طباعت شروع ہوگئی ہے۔ اور امید کی جاتی ہے کہ اخیر دسمبر ۵۳ء میں طیار ہو جائیگا اس لئے جن حضرات کا چندہ دسمبر ۵۳ء میں ختم ہو رہا ہے وہ سالانہ چندہ پیشگی ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمادیں، ورنہ وی پی میں انھیں ۷ر کا نقصان ہوگا۔

سالنامہ نہایت احتیاط سے روانہ کیا جائے گا اور اگر وہ کسی کو نہ ملا تو دوبارہ مُفت ارسال نہ ہوگا، اس لئے اگر آپ چاہتے ہیں کہ حفاظت کے ساتھ سالنامہ آپ کو پہونچ جائے تو سالانہ چندہ کے ساتھ ۶ر رجسٹری کے بھی روانہ فرمائیے۔

وی پی آٹھ روپیہ آٹھ آنے کا روانہ ہوگا

غیر خریدارانِ نگار کے لئے اس کی قیمت معہ محصول تین روپیہ آٹھ آنے ہے

ایجنٹ حضرات کے لئے دو روپیہ چار آنے

منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

جادو - ٹوٹکا - گنڈا - تعویذ وغیرہ

(جناب عبدالحکیم صاحب - چمپارن)

مسلمانوں کا یہ عقیدہ مشہور ہے کہ "جادو برحق لیکن اس کا کرنے والا کافر"، یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی کہ جب ایک چیز برحق ہے تو اس کا کرنے والا کیوں کافر قرار دیا جائے - کتب تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ پر بھی جادو کیا گیا تھا اور سورۂ فلق اسی کے رد کرنے کے لئے نازل ہوئی تھی - اگر جادو کو برحق مانا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ خدا کی قوت کے علاوہ کوئی دوسری قوت ایسی بھی موجود ہے جو خدا کے مقابلہ میں مخلوق پر اثر انداز ہوسکتی ہے - مہربانی فرماکر اس مسئلہ پر روشنی ڈالئے اور اسی سلسلہ میں بہت سی رسمیں مثلاً تعویذ، گنڈا، فال و شگون وغیرہ جو مسلمانوں میں رائج ہیں ان پر بھی اظہار رائے فرمایئے -

---

(نگار) جو مقولہ آپ نے اپنے استفسار کی ابتدا میں نقل کیا ہے وہ نہ قرآن کا ہے، نہ رسول کا، نہ صحابہ کا، نہ اکابر اسلام میں کسی قابل ذکر ہستی کا - یہ روایت بھی منجملہ ان بہت سی روایات کے ہے جو دوسری قوموں سے مسلمانوں میں رائج ہوگئی تھیں - اسلام یا تعلیم اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں -

اس میں شک نہیں کہ آج کل مسلمانوں میں واہمہ پرستی کثرت سے پائی جاتی ہے اور اسی میلان نے گنڈا، تعویذ وغیرہ کے ادارے قایم کئے، لیکن نفس اسلام سے اسے کوئی واسطہ نہیں - تاہم یہ سوال ضرور غور طلب ہے کہ انسان میں یہ واہمہ پرستی کیوں پیدا ہوئی - اصل یہ ہے کہ انسان پر اس کی تدریجی ترقی کے دوران میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب اسے طبعی مظاہر سے واسطہ نہ پڑا ہو اور اس نے ان طبعی حالات کو کسی غیبی قوت کا کرشمہ جان کر ان کو اپنے موافق بنانے کی کوشش نہ کی ہو -

بجلی، کڑک، سیلاب، زلزلہ، کوہ آتش فشاں یہ اور اسی قسم کے بہت سے طبعی مظاہر ایسے تھے جن کو عہدِ قدیم کا انسان سمجھنے کی کوشش کرتا تھا اور چونکہ وہ ان کی حقیقت سے بے خبر تھا اس لئے وہ ان کو کسی غیر انسانی قوت کا کام سمجھ کر یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اس قوت کو اپنے قابو میں لائے یا خوش کرے اور یہ تھی بنیاد مذہب اور سحر کی - ان دونوں میں فرق یہ تھا کہ مذہب کا مدعا تھا الحاح و زاری یا قربانیوں کے ذریعہ سے اُس قوت کو خوش رکھنا اور سحر کا مقصود تھا اس قوت کو مجبور کرکے اپنے موافق بنانا - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب سحر سے کافی متاثر ہوا اور اب تک بہت سے مذاہب میں اور انسانی معاشرت کے رسم و رواج میں وہی واہمہ پرستی پائی جاتی ہے - جادو، ٹوٹکا، جھاڑ پھونک، تعویذ وغیرہ سب اسی عہد جاہلیت کی یادگار ہیں جو مغرب ایسے ترقی یافتہ ممالک میں اس وقت بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہے -

---

تحریر کے سلسلہ میں جو مراسم ادا کئے جاتے تھے ان کی ایک قسم وہ تھی جسے ہم نقالی یا ٹوٹکا کہہ سکتے ہیں، یعنی جس امر کی تمنا کی جائے اور حاصل نہ ہو تو اس کا سوانگ رچایا جائے، مثلاً جزیرۂ مرے (Murray) میں جب پانی نہیں برستا تو وہاں کے لوگ یہ کرتے ہیں کہ ایک پتھر کا بت زمین میں گاڑ دیتے ہیں اور اسے پتیوں کے ٹکڑوں اور گھونگھوں وغیرہ سے جو پانی کی علامت ہیں چھپا دیتے ہیں، ناریل کے پتے بھی (جو ان کے نزدیک بادلوں کی علامت ہے) چاروں طرف نصب کر دئے جاتے ہیں، اسی کے ساتھ ایک مشعل جلا کر اسے چکر دیا جاتا ہے کیونکہ اس سے مراد بجلی ہوتی ہے اور بانسوں کے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر گرج کی صورت پیدا کرتے ہیں اور یہ سب کرنے کے بعد وہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے پانی کے دیوتا کو پانی برسانے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ خوفناک ٹوٹکا وہ تھا جو ازتک قوم میں نشوونما کے دیوتا کو کھیتی اُگانے پر مجبور کرنے کے لئے عمل میں لایا جاتا تھا۔ دشمن قبیلہ کے کسی قیدی کی کھال اتار کر پہن لیتے تھے اور جب تمام مراسم ادا ہو جاتے تھے تو اس کھال کو اُتار کر پھینک دیتے تھے۔

شمالی امریکہ کے قدیم باشندوں اور آسٹریلیا کے بعض قبایل میں ان جانوروں کی افزائش نسل کے لئے جو کھائے جاتے ہیں عجیب وغریب رسمیں اب بھی ادا کی جاتی ہیں، اور یہ سب تمثیلی قسم کے جادو یا ٹوٹکے سے تعلق رکھتی ہیں حد یہ ہے کہ علاج معالجہ کے سلسلہ میں بھی اس کو پیشِ نظر رکھا جاتا تھا، چنانچہ یوفریشیا کے پھول کو صرف اس لئے آنکھ کے امراض کے لئے استعمال کیا جاتا تھا کہ اس کی شکل آنکھ کی سی تھی اور یرقان میں ہلدی کھلائی جاتی تھی کیونکہ اس کا رنگ زرد ہے یہ گویا ہومیوپیتھی کی نہایت قدیم شکل تھی۔

جادو کی ایک اور قسم ہے جسے چھوت والا جادو کہنا چاہئے۔ یعنی اگر کسی چیز کا کوئی حصہ ہمارے قابو میں ہو تو پوری چیز پر اقتدار حاصل ہو سکتا ہے یا اس کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کے بال یا ناخن ہمارے پاس ہوں تو ہم اس کے ذریعہ سے اس شخص کو متاثر کر سکتے یا نقصان پہونچا سکتے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اب بھی عورتیں اپنے بالوں کو جو کنگھی کرنے سے ٹوٹتے ہیں حفاظت سے جمع کر کے کہیں چھپا دیتی ہیں یا کنویں میں ڈلوا دیتی ہیں تاکہ ان کے ذریعہ سے ان پر کوئی جادو نہ کر سکے۔ انگلستان کے بعض مقامات میں عورتیں اپنے سر کے بال ٹوٹے ہوئے بال کھڑکی کے باہر نہیں پھینکتیں کیونکہ وہ سمجھتی ہیں کہ چڑیاں ان سے اپنا گھونسلہ بنانے کا کام لیں گی اور اس سے ان کے سر میں درد پیدا ہو جائے گا۔ کٹے ہوئے ناخنوں کی حفاظت کا رواج بھی ہمارے یہاں اسی خیال کے تحت رائج ہوا۔ جزیرۂ ہوائی کے سرداروں کا اگالدان دور پانی کے کنارے دان کیا جاتا ہے تاکہ اس فضلہ کو دشمن حاصل کر کے جادو نہ کر سکے۔

یہ واہمہ پرستی ناموں سے بھی متعلق ہے، یعنی نام کو بھی بال یا ناخن کی طرح ایک شخص کے وجود کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ یہودیوں کا اعتقاد تھا کہ یہوداہ (خدا) کا اصلی نام جسے معلوم ہو جائے تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ مسلمانوں میں خدا کا اسم اعظم معلوم کرنا بھی اسی قبیل کی چیز ہے۔

ایک مصری روایت ہے کہ آئی سس، خداوند را کا اصلی نام معلوم کرنا چاہتا تھا اور بتاتا نہ تھا۔ آئی سس نے را کا تھوک جمع کر کے ایک سانپ طیار کیا جس نے را کو ڈس لیا۔ را کے جسم میں اس سے سخت درد پیدا ہوا تو آئی سس کو علاج کے لئے بلایا، اس نے کہا کہ جب تک تم اپنا اصل نام نہ بتاؤ گے میں علاج نہ کروں گا اور اس طرح وہ کامیاب ہو گیا۔ نفسیات انسانی کی تاریخ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ کسی کو اس کے نام سے پکارنا، گویا خود اس کی ذات کو پکارنا ہے۔ دشمن کو ہلاک کرنے کے لئے پتلے بنا کر اس میں سوئیاں چبھونا، اب بھی کہیں کہیں رائج ہے۔

قوت غیبی کو راضی کرنے کے لئے بعض روحانی و مادی واسطے بھی تلاش کئے جاتے تھے، چنانچہ بزرگوں کے مزاروں

کو بوسہ دینا، ان پر چادر چڑھانا، قوالیاں کرنا، مقبروں کی جالیوں میں منت کے تاگے باندھنا، تعزیوں میں رقعے لکھ کر لٹکانا یہ سب اسی عہد وحشت کی یادگار ہیں۔ انگلستان میں بھی بعض مقدس کنویں ایسے موجود ہیں جہاں لوگ جاکر اندر کوئی چیز پھینک دیتے ہیں اور مرادیں مانگتے ہیں۔

پولی نیشیا میں ایک خاص چیز ہے جسے ٹابو کہتے ہیں۔ اس سے مراد ان کا مذہبی قانون ہے جو خاص مراسم کے تحت مختلف مواقع پر نافذ کیا جاتا ہے، اور جس کے ذریعہ سے جایز و ناجایز افعال کی تحقیق کی جاتی ہے۔ مثلاً جزایر پاسفک میں اس قانون کی رو سے کوئی عورت مچھلی کے جال کے قریب نہیں جاسکتی جو خشک کرنے کے لئے ساحل پر پھیلا دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک شکاری شکار پر جانے سے دو تین دن قبل اپنی بیوی سے ملنا چھوڑ دیتا ہے کیونکہ انکے عقیدہ کے مطابق عورت شکار کو بھگا دیتی ہے۔

ہمزاد قابو کرنا، روحوں کا کسی کے سر آجانا، گنڈے تعویذ لکھنا، جھاڑ پھونک کرنا، انگوٹھیوں یا تختیوں پر کوئی طلسمی نقش بنواکر حفاظت کے لئے اپنے پاس رکھنا، فال نکالنا، شگون لینا، کاغذ یا چینی کی قابوں پر کچھ لکھ کر چاٹ لینا دشمن کی ہلاکت کے لئے سیفی پڑھنا، روبلا کے لئے خاص خاص نگینوں کی انگوٹھیاں پہننا، یہ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں عہدِ وحشت و واہمہ پرستی کی یادگار ہیں جن کا رواج بدقسمتی سے مسلمانوں میں اب بھی پایا جاتا ہے۔

ہمزاد یا موکل سے مراد کوئی ایسی غیر انسانی قوت ہے جس کو قابو میں لاکر بہت سی ناممکن باتیں ممکن بنائی جاسکتی ہیں۔ جیسے الف لیلہ میں الہ دین کا چراغ کے ذریعہ سے جن پر قابو پالینا اور اس سے آن کی آن میں بڑے بڑے محل تعمیر کرالینا۔ موکلوں کو قابو میں لانے کے لئے خاص خاص مورتیں بھی طیار کی جاتی تھیں۔ چنانچہ افریقہ میں ایسی بہت سی مورتیں دستیاب ہوئی ہیں۔

ہیرا، نیلم، پکھراج، فیروزہ وغیرہ کے سعد و نحس ہونے کے متعلق جو خیالات بعض جماعتوں میں پائے جاتے ہیں وہ بھی سراسر واہمہ پرستی ہے۔

انسان کے لئے ہمیشہ یہ مسئلہ دلچسپی کا باعث رہا ہے کہ وہ ایسی باتیں معلوم کرسکے جو اس کے علم سے باہر ہیں جیسے کسی کا مال چوری جائے تو وہ جاننا چاہتا ہے کہ کس نے چرایا، یا یہ کہ آیندہ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے اور اسی جذبہ نے فال، کہانت، شگون، جوتش، رمل، جفر وغیرہ کی بنیاد ڈالی۔

وسط افریقہ میں رواج ہے کہ جب وہاں کوئی جرم وقوع میں آتا ہے تو لکڑی کا ایک ٹکڑا لیکر اس پر کسی پتی کا عرق مل دیتے ہیں اور اسے دوسرے ٹکڑے سے جس پر کسی جانور کی تصویر کندہ ہوتی ہے رگڑتے ہیں اور اس دوران میں قبیلے کے افراد کا نام لیتے جاتے ہیں، جس کے نام پر رگڑ سے کوئی خاص علامت پیدا ہوجاتی ہے تو اسے مجرم مان لیا جاتا ہے اور اسے مشتبہ سمجھ کر زہر پلایا جاتا ہے اور جب وہ مرجاتا ہے تو اس کے گناہگار ہونے کا یقین ہوجاتا ہے۔ اسکیمو قوم میں مشتبہ شخص کو سمندر میں ڈال دیتے ہیں اور اگر وہ بچکر نکل آتا ہے تو اسے بے گناہ سمجھتے ہیں ورنہ گناہگار۔

فال کے سلسلہ میں جانوروں سے بھی شگون لیا جاتا ہے۔ مثلاً بلی کا راستہ کاٹ جانا منحوس سمجھا جاتا ہے، کوے کا صبح صبح آکر بولنا مہمان کی آمد کا پیغام تصور کیا جاتا ہے، اُلو کا کسی جگہ بولنا کسی حادثہ کی پیشین گوئی تسلیم کیا جاتا ہے اسی سلسلہ میں چھینک آجانا یا کسی کانے کا مل جانا بھی ہے کہ یہ دونوں باتیں بدشگونی سمجھی جاتی ہیں۔ اگر ہاتھ سے شیشہ گرکر ٹوٹ جائے یا سونے کا کوئی زیور کھوجائے تو اسے بھی منحوس خیال کیا جاتا ہے۔

خواب کی تعبیریں بھی اسی واہمہ پرستی سے تعلق رکھتی ہیں۔ خواب کی تعبیریں بیان کرنا بڑی پرانی چیز ہے —

خواب دیکھنے کی وجہ عہدِ قدیم میں یہ قرار دی جاتی تھی کہ خواب دیکھنے والے کی روح جسم سے علٰحدہ ہوکر دُنیا کی سیر کرتی ہے جو اعزہ واحباب مرگئے ہیں ان کی روحوں سے ملتی ہے، اور اس سلسلہ میں خواب کے اچھے یا بُرے ہونے پر حکم لگایا جاتا تھا

ریاضی واعداد کے سلسلہ میں بھی واہمہ پرستی سے کام لیا گیا اور اسی کا نتیجہ تعویذ نویسی تھا۔ عہد قدیم میں بعض اعداد کے اندر بھی طلسمی قوت تسلیم کی جاتی تھی۔ مثلاً تین کا عدد بہت مقدس سمجھا جاتا تھا اور یہی وہ عقیدہ تھا جس نے عیسائیوں میں تثلیث اور ہندوؤں میں تریمورتی (وشنو، شیو، برہما) کو رائج کیا۔ قدیم مصریوں کے یہاں بھی تثلیث کا عقیدہ پایا جاتا تھا۔ اور ہومر وکنفوشش کا قول بھی یہی ہے کہ "ہر چیز تین میں منقسم ہے"۔ "ایک میں تین۔ یا۔ تین میں ایک" کی اہمیت غالباً جنسی جذبہ سے تعلق رکھتی ہے، کیونکہ مرد کو تخلیق کا سبب اولین قرار دیا جاتا ہے اور اس کے عضو کو "تین میں ایک اور ایک میں تین" کہہ سکتے ہیں۔

فیثاغورس اور یونان کے دوسرے ریاضی داں اعداد کو بھی بہت سے پوشیدہ رازوں کا مرکز خیال کرتے تھے اور اس سلسلہ میں بہت سے "طلسمی مربعے" تختیوں پر نقش کرکے گلے میں پہنے جاتے تھے۔ مثلاً ستارۂ مشتری کا طلسمی مربع یہ تھا:-

۱۶	۳	۲	۱۳
۵	۱۰	۱۱	۸
۹	۶	۷	۱۲
۴	۱۵	۱۴	۱

اس میں افقی وعمودی طور پر ہر چار خانوں کے اعداد کا مجموعہ ۳۴ ہوتا ہے۔

مریخ کا مربع جسے تختی پر نقش کرکے حادثات سے بچنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ ہے:-

۱۴	۱۰	۱	۲۲	۱۸
۲۰	۱۱	۷	۳	۲۴
۲۱	۱۷	۱۳	۹	۵
۲	۲۳	۱۹	۱۵	۶
۸	۴	۲۵	۱۶	۱۲

اس میں جس طرف سے آپ پانچ خانوں کے اعداد جمع کریں گے تو حاصل جمع ۶۵ نکلے گا۔

تعویذ نویسی کی رسم بھی مسلمانوں میں قدیم یونانیوں سے آئی ہے اور مذہبی نقطۂ نظر سے اس کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔

اگر کسی مہینہ کا پرچہ آپ کو نہ ملے

تو آپ ہم سے دوبارہ طلب کرسکتے ہیں لیکن محکمۂ ڈاک کے جدید قواعد کی رو سے ہم مجبور ہیں کہ اسے بسرنگ روانہ کریں، جس کے لئے آپ کو تین آنے ادا کرنے پڑیں گے۔ اپنی مقامی ڈاک کا انتظام پوری طرح کرلیجئے کیونکہ ہمارے یہاں سے بہت جانچ کے بعد پرچہ روانہ کیا جاتا ہے۔ نیجر

دعوتِ نقد و نظر

ادبیات میں سب سے زیادہ مشکل فن، شعر گوئی ہے، اور بدقسمتی سے آج اسی کو سب سے زیادہ آسان سمجھ لیا گیا ہے۔ جس حد تک صرف وزن شعری کا تعلق ہے، یقیناً اس میں کوئی اشکال نہیں، ہر شخص چند الفاظ کو جمع کر کے ایک خاص وزن کے ساتھ انھیں پیش کر سکتا ہے، لیکن شعر دراصل اس سے ماورا کچھ اور چیز ہے۔ شعر نام صرف عروض و قافیہ کی پابندی کا نام نہیں، بلکہ اس میں ہم کو یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ:-

۱ - زبان و محاورہ کا صحیح استعمال ہوا ہے یا نہیں۔

۲ - مفہوم رکیک و سخیف یا پامال تو نہیں ہے۔

۳ - الفاظ و تراکیب میں غلطی یا ثقل یا تنافر صوتی تو نہیں پایا جاتا۔

۴ - جس مفہوم کو ہم ظاہر کرنا چاہتے ہیں وہ پوری طرح ادا ہوا یا نہیں۔

۵ - اسلوب بیان میں کوئی ندرت و تازگی ہے یا نہیں۔

۶ - اظہار خیال میں تصنع و تکلف تو پیدا نہیں ہوا۔

۷ - کوئی تعبیر و توجیہ بے محل تو نہیں کی گئی۔

۸ - تشبیہ و استعارہ سریع الانتقال الی الذہن ہے یا نہیں۔

۹ - کوئی شاعرانہ ادعا بغیر ثبوت کے تو نہیں رہ گیا۔

۱۰ - غلو و مبالغہ سے اگر کام لیا گیا ہے تو اس میں کوئی طرفگی پائی جاتی ہے یا نہیں۔

۱۱ - کوئی بلند و عمیق جذبہ ظاہر کیا گیا ہے یا نہیں۔

۱۲ - عروض و قافیہ کے لحاظ سے تو اس میں کوئی غلطی نہیں پائی جاتی۔

الغرض شاعری محض الفاظ کا کھیل نہیں، بلکہ اس کے لئے خاص ذوق اور بڑی کاوش و مشق کی ضرورت ہے۔

پہلے لوگ برسوں استادوں سے اصلاح لیتے تھے، فنی تعلیم حاصل کرتے تھے، اساتذۂ قدیم کے کلام کا مطالعہ کرتے تھے، جب کہیں جا کر شعر کہنے کی جرأت انھیں ہوتی تھی۔ اس وقت یقیناً حالات بدل گئے ہیں، زندگی و ماحول کا تقاضہ کچھ اور ہے پھر حالات کے لحاظ سے خیالات تو بدل سکتے ہیں اصول میں بھی ترمیم ہو سکتی ہے، لیکن بے اصولی کو اصول کبھی قرار نہیں دیا جا سکتا ہے اس وقت رسایل و جرایدمیں کلاسکل و غیر کلاسکل شاعری کے نمونے اکثر نظر آتے ہیں، لیکن وہ کس حد تک معیاری ہوتے ہیں اس پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ اس لئے میری رائے میں کبھی کبھی فنی حیثیت سے بھی اس مسئلہ پر غور کرنا چاہئے لیکن اس کی مناسب صورت یہ نہیں ہے کہ کوئی طویل مقالہ یا مضمون اس موضوع پر لکھا جائے، بلکہ نمونہ کے طور پر ——— کسی مستند استاد کے کلام کو پیش کر کے ارباب ذوق کو اس پر اظہار رائے کی دعوت دینا زیادہ دلچسپ طریقہ ہوگا۔ چنانچہ اس اشاعت سے ہم نگار میں یہ سلسلہ شروع کرتے ہیں اور ملک کے ایک نہایت مشہور و مقبول شاعر کے کلام سے چند اشعار پیش کر کے اہل ذوق کو رائے زنی کی دعوت دیتے ہیں ——— ہم نے ان اشعار کو نہیں لیا جو باوجود غلط ہونے کے شعر نہیں ہیں، کیونکہ ان کی تعداد بہت ہے، بلکہ صرف ان اشعار کو لیا ہے جو واقعی ہمارے نزدیک

کسی رکسی حیثیت سے ناقص ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ اہل نقد و نظر اس سلسلہ کو پسند فرمائیں گے اور اپنی رائے بھیجنے میں عجلت سے کام لیں گے تاکہ آئندہ اشاعت میں ہم اسے شایع کر سکیں۔ مجھے اگر کسی کی رائے سے اتفاق یا اختلاف ہوگا تو اسے فٹ نوٹ میں ظاہر کر دونگا

کچھ داغِ دل سے تھی مجھے امید عشق میں
سو رفتہ رفتہ وہ بھی چراغِ سحر ہوا

اِدھر جوشِ مستی، اُدھر چشمِ شوق،
مصیبت میں بندِ نقاب آگیا،

پردہ رکھنا تھا جو منظور، تو عاشق کے لئے
دامنِ یار کو لازم تھا، گریباں ہونا،

سُن کے افسانۂ غم، باغ میں کمھلا گئے پھول
شاق گزرا مجھے بلبل کا غزل خواں ہونا

چاہئے عشق میں مجھے آپ ہی کا جمال سا
داغ ہر ایک بدر سا، زخم ہر ایک ہلال سا

نگہِ شوق نے سب کھول دئے بندِ نقاب
سہل سمجھے تھے وہ پابندِ حیا ہو جانا

ہر وقت اک خمار تھا، ہر دم سرور تھا
بوتل بغل میں تھی کہ دلِ ناصبور تھا،

جس دل کو تم نے لطف سے اپنا بنا لیا
اُس دل میں اک چھپا ہوا نشتر ضرور تھا

دل نہ تھا، جان نہ تھی، سوز نہ تھا، ساز نہ تھا
میں ہی میں تھا، مرے ہمراہ، کوئی راز نہ تھا

بہت روکا تمھارے وعدۂ دیدار نے ورنہ
وہاں ہوتی نہ میری بیخودی بھی، میں جہاں ہوتا

خلوت میں غمِ فرقت، اس طرح بیاں ہوتا
وہ میری زباں بنتے، میں ان کی زباں ہوتا

تھی سیر اگر میں بھی ساتھ اُن کے وہاں ہوتا
آنسو بھی رواں ہوتے، دریا بھی رواں ہوتا

جنوں میں سینے کو بیٹھے ہیں جیب کے ٹکڑے
خبر نہیں، کہ گریباں بھی تار تار ہوا

زخم کو مرہمِ دل، درد کو درماں سمجھا
چارہ گر، خوب علاجِ غمِ پنہاں سمجھا

عشق کا راز، وہی سوختہ ساماں سمجھا،
جس نے دامن کبھی جانا، نہ گریباں سمجھا

تھا کھیل سا پہلے عشق، لیکن جو کھلیں آنکھیں
ڈوبا ہوا رگ رگ میں، وہ تیرِ نظر دیکھا

اُس چشمِ غزالیں کو مے خانۂ دل پایا،
اُس روئے نگاریں کو، فردوسِ نظر دیکھا

اے نگاہِ یاس! یہ کیا رنگِ محفل ہوگیا
میں نے جس دل کی طرف دیکھا، مرا دل ہوگیا

جب تو کچھ ظرف ہے اے دل ترے پیمانے کا
رازِ مے خانے سے باہر نہ ہوئے خانے کا

کھلے گا چارہ گر پر رازِ غم، کیا درد کے ہوتے
کہ آتا ہے اسے خود نبض کی رفتار ہو جانا

جس پر برس گئی کبھی برقِ جمالِ یار
ہر ذرہ آفتاب ہے اُس کے مزار کا

اللہ اللہ، یہ کمالِ جذبۂ پنہانِ عشق
جو گرا آنکھوں سے آنسو حُسن کا دریا ہوا

بڑھتے بڑھتے آفتابِ روزِ محشر بن گیا
دل کی خاکستر میں اک شعلہ تھا جو بھڑکا ہوا

رگ رگ میں دل تھا، دل میں نہاں سوز و ساز تھا
وہ دن بھی کیا تھے، جب میں سراپا گداز تھا،

اللہ رے، مجبوریِ آدابِ محبت
گلشن میں رہے، اور گلستاں نہیں دیکھا

شریکِ نالہ میرا بھی جو اندازِ فغاں ہوتا
چمن میں ہر لبِ خاموش، بلبل کی زباں ہوتا

آج کے حسن بن صباح

تعصبات کی صرصر نگاہ و فکر کا حبس
"عقیدتوں" کی جوانی خیال کا بچپن

جبیں پہ نقش نمایاں سجود پیہم کا،
غرورِ سجدہ سے پھولی ہوئی رگِ گردن

خدا کے ہمدمِ دیرینہ جبرئیل کے یار
سفیرِ عرشِ علیٰ ایلچیِ خلدِ عدن

نظر میں حضرتِ یزداں کی دوستی کا خمار
نفس میں طنطنۂ وصلِ حور و نہرِ لبن

جھکی جھکی سی کمر موت کی کھلی آغوش
حیاتِ رفتہ کی آواز رعشہ دار بدن

یہ کپکپی ہے مسلسل کہ بجھ رہا ہے چراغ
شکن شکن ہے بدن کی کہ زندگی کا کفن

یہ سوچتا ہوں کہوں دل کی بات یا نہ کہوں
عصا بدست کھڑا ہے شباب کا مدفن

وہ "آفتاب" ترے سر سے ہو رہا ہے طلوع
کہ بال بال بنِ مو سے پھوٹتی ہے کرن

جلو میں آئینہ رکھکر خضاب ریش نہ کر
یہ موج دھو نہ سکے گی رخ و جبیں کی شکن

یہ خانہ ساز اندھیرا نہ کام آئے گا
یہ "آفتاب" تجھے لے کے ڈوب جائیگا!

پروفیسر شور

اکرم دھولیوی :-

پھر محبّت داستانِ دل کو دہرانے لگی
پھر مجھے آغوشِ غم میں نیند سی آنے لگی

پھر طبیعت میرے ہاتھوں سے نکل جانے لگی
پھر نظر میں ایک برقِ حسن لہرانے لگی

دل کی فطرت ہی بہت نازک ہے اسکا کیا علاج
ورنہ تیری بے رخی کیوں ٹھیس پہونچانے لگی

کیا اسی کو زندگی کہتے ہیں اے ذوقِ حیات
ہر تمنا دل ہی دل میں گھٹ کے رہ جانے لگی

کونسا فقرہ غم دل کا زباں پر آگیا
داستاں گو کیوں تری آواز بھرانے لگی

غالباً کچھ رہ گئی ہیں ٹھوکریں میرے لئے
عزم منزل پر طلب پھر مجھکو اکسانے لگی

فصل گل آئی تھی اکرم لے کے پیغام سکوں
دو ہی دن میں پھر چمن پر برق منڈلانے لگی

رودادِ تنہائی

آہ ! یہ رنگیں فضائیں، یہ بہاریں، یہ سماں جھومتی کافر گھٹاؤں سے یہ رنگِ آسماں
ہائے یہ توبہ شکن راتوں میں جورِ آسماں کیا قیامت ہے کہ ایسے میں کہاں تو میں کہاں
اے مری وجہ سکوں رودادِ تنہائی نہ پوچھ!

نوعروسِ صبح کی یہ چال اٹھلائی ہوئی دوشِ گردوں پر یہ زلفِ شام لہرائی ہوئی
اُف یہ ہر شے کی جوانی جوش پر آئی ہوئی میری دُنیا پر اُداسی کی گھٹا چھائی ہوئی
اے مری وجہ سکوں رودادِ تنہائی نہ پوچھ !

قصرِ صبر و آگہی کو اُف یہ ڈھا دینے کے دن دھجیاں تک جیب و دامن کی اُڑا دینے کے دن
دل کو سیلِ شوق و مستی میں بہا دینے کے دن اپنی ہستی تیری ہستی میں مٹا دینے کے دن
اے مری وجہ سکوں رودادِ تنہائی نہ پوچھ !

تو چھٹی ہے جب سے اے آئینۂ بزمِ حیات، لرزہ براندام ہے عیش و طرب کی کائنات
بے مزہ شام و سحر بے رنگ دن، بے کیف رات تیرے دیوانے کو ممکن ہی نہیں غم سے نجات
اے مری وجہ سکوں رودادِ تنہائی نہ پوچھ !

ایک ناکامِ تمنّا کی یہ رودادِ الم ! ہائے خود وجہ سکوں بن جائے جسکی وجہ غم
پیکرِ حرماں نصیبی، ایک تصویرِ الم ! اِک مجسم درد، اِک خو کردۂ جورِ ستم
اے مری وجہ سکوں رودادِ تنہائی نہ پوچھ !

مختار علی ام۔ اے شاہ آبادی

نفیس قادری سونگیری :-

کچھ اس ادا سے چلی باغ میں نسیمِ بہار
روش روش پہ تمنا نے پھول برسائے

ترے قریب بھی صورت کہاں تسلّی کی
سکون آنکھ کو آئے تو دل مچل جائے

قدم قدم پہ سہارا امید کا لے کر،
ہر اک نفس میں تمنا کے جال پھیلائے

کسی کی بزم میں پہونچے تھے آرزو لیکر
دلِ غریب کی دُنیا اُجاڑ کر آئے

ترے خیال سے تسکیں نہ مل سکی دل کو
مآلِ کارِ محبّت پہ ہم تو پچھتائے

ندیم جعفری :-

بہت شگفتہ و واضح بڑے خلوص کے ساتھ
پیام تیری محبّت کے آئے ہیں کیا کیا !

وفا تو ایک طرف، دوستوں نے دانستہ
ہماری راہ میں کانٹے بچھائے ہیں کیا کیا !

یہ کون رات کو آیا نقاب اُلٹے ہوئے
ستارے تابہ سحر جھلملائے ہیں کیا کیا !

بجا، کہ دین کے تاریک راستوں میں ندیم
چراغ کفر کے میں نے جلائے ہیں کیا کیا !

مری تو عُمر ترے انتظار میں گزری
یہ اور بات ہے دُنیا بھی انتظار میں ہے

مرے نصیب کہ مجھ پر نہیں ہے لطف کوئی
وگرنہ خوئے تلطّف مزاج یار میں ہے

نگار عبدالحی کھنوی

چند نایاب فارسی ادب کی کتابیں

نگار عبدالحی لکھنوی

۱- بہار بوستاں — از منشی ٹیک چند بہار۔ مطبوعہ محمود المطابع دہلی۔ ۱۳۰۱ھ۔ قیمت دس روپیہ
۲- دیوانِ کلیم (قلمی)۔ قدیم۔ ناقص الطرفین بقدر یک ورق۔ خوشخط۔ قیمت چالیس روپیہ
۳- کلیات خاقانی (قلمی)۔ مکتوبہ سید جمال الدین ابن سید محمد الحسینی۔ ۱۰۴۲ھ قیمت پچھتر روپیہ
۴- مثنوی سحر حلالی و دیوان حلالی و دیوان چشتی اجمیری (قلمی) مکتوبہ ۱۲۶۹ھ۔ قیمت بارہ روپیہ
۵- برہان قاطع۔ مکمل چار جلد۔ صفحات ۱۶۴۱۔ مطبوعہ ۱۸۲۲ء۔ لوہے کا چھاپہ، کلکتہ۔ قیمت ساٹھ روپیہ
۶- بوستانِ خیال (اُردو) از خواجہ قمر الدین خاں مطبوعہ ۱۸۸۳ء۔ ہر دو جلد۔ دوسری جلد کے ابتدائی دس صفحے ناقص ہیں۔ بیس روپیہ

پہلے اسے پڑھ لیجئے

(خریداران نگار کے لئے نہایت ضروری اطلاع)

ہر مہینے نگار نہایت احتیاط سے ہر خریدار کے نام روانہ کیا جاتا ہے پھر بھی بعض پرچے ڈاک کی بدنظمی یا مقامی ڈاکیوں کی بے پروائی کی وجہ سے گم ہوجاتے ہیں۔ ہم کو جب اس کی اطلاع ملتی ہے تو ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے لیکن اس کا کوئی علاج نہیں اس لئے ہم اطلاع ملنے پر دوبارہ پرچہ روانہ کردیا کرتے تھے، لیکن اب محکمۂ ڈاک کے جدید قواعد کی رُو سے نگار کی تاریخ اشاعت ہر ماہ کی سات مقرر کردی گئی ہے اور اس کے بعد ایک پیسہ کی جگہ ہمکو ڈیڑھ آنے کا ٹکٹ لگانا پڑے گا۔ یہ صرف بہت زیادہ ہے لیکن اگر اسے برداشت کرلیا جائے تو بھی یقینی نہیں کہ پرچہ دوبارہ آپ کو ملجائے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ پرچہ بیرنگ روانہ کیا جائے جو تین آنے ادا کرنے پر آپ کو ملے گا، اس طرح پرچہ آپ کو یقینی مل جائے گا۔

آپ اپنے مقامی ڈاک خانہ اور پوسٹ مین کو بھی ہدایت کرتے رہئے کہ وہ احتیاط سے آپ کی ڈاک آپ تک پہونچاتا رہے تاکہ اس کی نوبت ہی نہ آئے کہ پرچہ آپ کو نہ پہونچے اور دوبارہ بیرنگ وصول کرنا پڑے۔ منیجر

پاکستان کے خریدارانِ نگار

اپنا چندہ آٹھ روپیہ چھ آنے (چھ آنے زاید سالنامہ کے رجسٹرڈ بھیجنے کے ہیں) ذیل کے پتوں میں سے کسی پتہ پر بھیجکر سلسلۂ خریداری جاری رکھ سکتے ہیں — اگر آپ نے ۶ر زاید نہ بھیجے تو ہم سالنامہ کے پہونچنے کے ذمہ دار نہ ہوں گے اور دوبارہ مُفت روانہ نہ کرسکیں گے۔

۱- ڈاکٹر ہاشمی - ۲۲۲، الٰہی بخش کالونی کراچی ——— ۲- ملک دین محمد اینڈ سنز مال روڈ لاہور

احباب پاکستان ہماری مطبوعات حاصل کرنے کے لئے

فیروز سنز بندر روڈ کراچی سے مراسلت فرمائیں

منیجر نگار

نگار کا سالنامہ ۵۴ء

(فرمانروایانِ اسلام نمبر)

جن خصوصیات کا حامل ہوگا، ان کو مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ یہ ایک دائرۃ المعارف ہے جس کے مطالعہ کے بعد آغاز عہد نبوی سے اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے متعلق آپ کو معلوم ہوسکے گا کہ وہ کب، کہاں اور کن حالات میں قایم ہوئیں، ان کے عروج و زوال کے کیا اسباب تھے، ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں کیونکر منتقل ہوئیں، ان کے فرمانرواؤں کے کیا نام تھے اور ان میں سے ہر ایک نے کس سنہ سے کس سنہ تک حکومت کی۔

اس سالنامہ میں دو نقشے ایسے بھی شامل ہوں گے جو پورے سالنامہ کا نچوڑ ہیں اور جن کو دیکھ کر بیک نگاہ اسلامی حکومتوں کے عروج و زوال کی پوری تصویر آپ کے سامنے آجائے گی۔

قیمت فی کاپی علاوہ محصول تین روپیہ۔ خریدارانِ نگار کے لئے مُفت، لیکن چھ آنے زاید مصارف رجسٹری کے لئے آنا ضروری ہیں۔

منیجر

اگر آپ کا چندہ دسمبر ۵۳ء میں ختم ہو رہا ہے

تو مناسب یہی ہے کہ آپ جنوری ۵۴ء میں سالنامہ کی وی پی کا انتظار کریں جو سات روپے آٹھ آنے میں روانہ ہوگا، لیکن اگر آپ چندہ پیشگی بھیجنا مناسب سمجھتے ہیں تو ازراہ کرم منی آرڈر آٹھ روپیہ چھ آنے کا روانہ فرمایئے تاکہ سالنامہ ذریعہ رجسٹری روانہ کیا جائے، ورنہ گم ہونے کی صورت میں ہم دوبارہ اسے مُفت روانہ نہ کرسکیں گے۔

منیجر نگار لکھنؤ

اگر آپ کا چندہ دسمبر ۵۳ء میں ختم نہیں ہوتا

تو ایک لفافہ کے اندر چھ آنے کے ٹکٹ رکھ کر سالنامہ کی رجسٹری کے لئے ضرور بھیجدیجئے۔ ورنہ گم ہونے کی صورت میں ہم دوبارہ اسے مُفت فراہم نہ کرسکیں گے بلکہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ ۶ر ذریعہ منی آرڈر بھیجئے کیونکہ دونوں صورتوں میں آپ کے آٹھ آنے صرف ہوں گے اور منی آرڈر کا پہونچنا بالکل یقینی ہے۔ لفافہ کے اندر ٹکٹ رکھے ہوئے ممکن ہے ہمیں نہ مل سکیں۔

منیجر نگار لکھنؤ